ستمبر ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ: چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۹ ربیع الثانی ۱۳۸۳ ہجری شمارہ ۳

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ	امین احسن اصلاحی	۲
تدبر قرآن		
تفسیر سورۂ بقرہ	"	۱۱
افادات فراہی ؒ		
احکامِ شریعت کا مقصد اور اصول تشریع	خالد مسعود صاحب ایم ایس سی	۳۴
مراسلہ و مذاکرہ		
حلقۂ تدبر قرآن سے متعلق	مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ	۴۱
مقالات		
حفاظتِ قرآن	جناب خالد مسعود صاحب	۴۵
تقریظ و تنقید	خ - م	۵۵

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ،
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمانپورہ ـــــ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ
منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"
باغ گونگے نواب ـــــ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

پچھلے مہینے میں، یکے بعد دیگرے، ہماری قوم کے دو نامور آدمی اُٹھ گئے۔ ایک ہماری قومی اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین خان صاحب، دوسرے خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی۔ ہم دونوں مرحومین کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور ان کی نیکیوں اور ان کی قومی و ملی خدمات کا ان کو صلہ دے۔

مولوی تمیز الدین خاں صاحب مرحوم سے ہمیں شخصاً ملنے کا تو کبھی موقع نہیں ملا لیکن ان کے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے ان کے لئے ہمارے دل میں ہمیشہ بڑا احترام رہا۔ ہمارے ملک کے صف اوّل کے لیڈروں میں وہ واحد شخص تھے جو عملاً، قولاً، صورۃً ہر اعتبار سے مسلمان تھے۔ اپنے عقائد اور مسلک کے لحاظ سے بھی جہاں تک ہمیں علم ہے وہ نہایت صحیح العقیدہ، شرک و بدعت کے تمام شوائب سے بالکل پاک تھے۔ بڑوں میں خصوصاً چوٹی کے بڑوں میں، ہماری مشرقی تہذیب و روایات کی نمائندگی تو بس سمجھیے کہ تنہا انہی کے دم سے تھی۔ پھر اس اسلامیت و مشرقیت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ زمانے کے دساتیر و قوانین کے رموز و نکات سمجھنے کے معاملہ میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے بحیثیت اسپیکر کے جس قابلیت، جس وقار اور جس فرض شناسی کے ساتھ قومی اسمبلی کی رہنمائی کی ہے وہ ہماری پوری پارلیمانی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے۔ ہماری قومی اسمبلی کا جو کچھ حال رہا ہے اور جو کچھ ہے ملکی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے، یہ صرف مولوی تمیز الدین خان صاحب مرحوم کا کمال تھا کہ انہوں نے کسی نہ کسی حد تک اس کا بھرم قائم رکھا۔ ان کو پاکستان کے

دونوں بازوؤں میں جو غیر معمولی ہر دل عزیزی حاصل تھی اس میں بلا استثنار کوئی شخص بھی ان کا شریک و سہیم نہیں تھا۔ سیاست کے خارزار میں اُلجھے رہنے کے باوجود انہوں نے ایک باہمہ و بے ہمہ زندگی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال قائم کی۔ صوبائی اور علاقائی تعصب کی وبا جس میں ہمارے اہل سیاست اس وقت عام طور پر مبتلا ہیں، مولوی صاحب مرحوم اس سے بالکل محفوظ تھے۔ وہ قومی و ملکی معاملات کو ایک پاکستانی محب وطن کے نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسمبلی کے اسپیکر کی حیثیت سے رواداری اور غیر جانبداری کی جو مثالی انہوں نے قائم کی وہ ان کے جانشینوں کے لئے ایک روشن مثال ہے، کاش وہ اس کی تقلید کر سکیں! ہمارے موجودہ دستور کے رُو سے اسپیکر کا عہدہ صدر کے عہدہ کے بعد سب سے بڑا عہدہ ہے بلکہ بعض اعتبارات سے اس کو عہدہ صدارت کے ہمپایہ قرار دیا جا سکتا ہے، اس عہدہ پر پہنچنے کے بعد بھی جس شخص کی وضع قطع، معمولات، روایات، نظریات میں کوئی ادنیٰ تغیر بھی رونما نہ ہو سکا اسکے ایک صاحب کردار شخص ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ ہماری قوم کے پاس سب کچھ موجود ہے لیکن اعلیٰ کردار کے اشخاص کی بڑی کمی ہے۔ بالخصوص ہماری سیاست کا میدان تو باوقار اور اعلیٰ سیرت و کردار کے اشخاص سے بالکل ہی خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب مرحوم کی قبر ٹھنڈی رکھے اور ہماری قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے!!

علامہ مشرقی بھی ہماری قوم کے اندر ایک منفرد سیرت و کردار کے لیڈر تھے۔ اگرچہ ہمیں کبھی انکے نظریات سے پورا پورا اتفاق نہ ہو سکا لیکن اس امر میں ہمیں کبھی شک نہیں ہوا کہ اپنی قوم کی سربلندی کے لئے ان کے دل کے اندر بڑا غیر معمولی جوش و جذبہ تھا۔ وہ اسلام اور غلبہ کو لازم ملزوم سمجھتے تھے اس وجہ سے اس دور میں مسلمانوں کی بے بسی پر ان کا دل بہت کڑھتا تھا۔ انہوں نے اس حیرت انگیز تضاد سے بڑا گہرا تاثر لیا کہ مسلمان قومیں اسلام کی مدعی ہیں لیکن دنیا میں ذلیل و خوار ہیں، اور مغربی قومیں اسلام کی منکر ہیں لیکن نہ صرف مشرق کی غیر مسلم قوموں پر بلکہ خود مسلمانوں پر بھی حاوی اور غالب ہیں جب انہوں نے اس صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی نظر اس بات کی طرف گئی کہ ہم مسلمان صرف اسلام کی چند روایات کے پرستار بن کر رہ گئے ہیں اور اسلام کا اصلی کردار دُنیا کی غالب قوموں نے اپنا رکھا ہے۔ ان غالب قوموں کے کردار میں سب سے زیادہ اُبھری ہوئی چیز جو ان

کو نظر آئی وہ ان کا عسکری جوش و جذبہ اور ان کی فوجی تنظیم تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ اور ایشیا کے متعدد ملکوں میں عسکری تحریکیں بڑے زور شور سے اُٹھیں اور ستم رسیدہ ممالک کے حساس لوگوں کو ان تحریکوں نے اپیل کیا۔ علامہ مشرقی مرحوم بھی ایک نہایت حوصلہ مند انسان تھے، انہوں نے بھی وقت کے حالات سے بڑا گہرا اثر لیا اور اپنی قوم کے اندر عسکری تنظیم کا صور اس زور سے پھونکا کہ فی الواقع ان کی تحریک نے پورے ملک میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں ایک خاص قسم کا زور تھا جو عسکری جوش و جذبہ رکھنے والے بوڑھوں اور جوانوں پر جادو کا اثر کرتا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے علماء کے سوا ہر طبقہ کو متاثر کیا۔ ان میں عسکری تنظیم کی حیرت انگیز قابلیت تھی چنانچہ انہوں نے عملاً خاکساروں کا ایک لشکر تیار کر دیا۔ اس حقیقت کا کوئی منکر ہی سے انکار کر سکیگا کہ ان کے ماننے والے ان کے فدائی تھے اور وہ اطاعت مطلق کے حد تک ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اسلام کو ایک پُرقوت سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کرنے میں بھی ان کا ایک خاص مقام ہے وہ تمام سیاسی اصطلاحیں جو آج بہت سے لوگ اسلام کا سابقہ و لاحقہ بنائے ہوئے ہیں، انہی کی اولیات میں سے ہیں۔ ہمیں، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، علامہ مرحوم کے نظریات سے کبھی اپیل نہیں کیا لیکن ہم نے ان کو ہمیشہ اپنی دھن کا پکا سمجھا۔ وہ ریاضی میں اتنی اونچی ڈگری رکھتے تھے کہ اپنے ملک میں بھی اور اپنے ملک سے باہر بھی اس کی بڑی قیمت وصول کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ساری زندگی ایک دوسرے ہی عشق میں گزار دی۔ کونسلوں اور اسمبلیوں کی ممبری اور وزارت و صدارت کے چکر میں بھی وہ کبھی نہیں پھنسے، حالانکہ اس میدان میں اُترتے تو ان کے لئے بڑے امکانات تھے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کی سربلندی کے لئے جس چیز کو اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا، اس سے انہیں کوئی چیز منحرف نہیں کر سکی۔ اپنی تحریک میں وہ کامیاب ہوئے یا نہیں لیکن اپنی تحریک کے ساتھ وفاداری میں وہ سو فیصدی کامیاب رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(۲)

امام حمیدیؒ کی مُسند کی طبع و اشاعت کی خوش خبری قارئین میثاق کو پہنچانے میں ہم نے بڑی دیر لگائی۔ یہ گراں قدر کتاب عرصہ ہوا اس کے محترم ناشروں کی طرف سے ہمیں موصول ہو گئی تھی،

ہم نے فرصت کے انتظار میں اس کو رکھ لیا تھا کہ تفصیل کے ساتھ کتاب کی خصوصیات اور اس کے فاضل اور محقق ایڈیٹر ـــــ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ـــــ کی خدمات کا تعارف کرائیں گے لیکن سخت ندامت ہے کہ اب تک یہ فرصت میسر نہ آسکی۔ اب مزید تاخیر ایک بہت بڑی سعادت سے محرومی کا باعث ہوگی اس وجہ سے مختصراً اس کا تذکرہ کر دینا ان صفحات میں ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اس پر تفصیلی تبصرہ کے لئے موزوں اشخاص پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں موجود ہیں اور وہ اس کام کے ہم سے زیادہ اہل ہیں۔

علم حدیث کے ایک ایسے بڑے ذخیرہ کا منصہ شہود پر آنا جیسا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے آیا ہے بجائے خود ایک عظیم بشارت ہے جس کا بدل دنیا کی کوئی بھی دوسری چیز نہیں ہو سکتی بشرطیکہ ہمارے اندر علم رسولؐ کی حقیقی قدر ہو۔ ہمارے نزدیک تو اگر ہمارے ملک میں سونے کی کان بھی دریافت ہوتی، تو وہ بھی اس کے مقابل میں ہیچ تھی۔ امام حمیدیؒ کا فن حدیث میں جو مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یہ امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث کے شیخ، ابن عیینہؒ جیسے بلند پایہ شیخ حدیث کے شاگرد، امام شافعیؒ جیسے بلند رتبہ امام کے سماع حدیث میں رفیق ہیں۔ ایک ایسے عالی مقام امام کی ایک نادر الوجود کتاب کا ہمارے ہاتھوں میں پہنچ جانا کتنی بڑی نعمت ہے اور جن لوگوں نے اس معدن کو دریافت کیا اور اس کے جواہرات ہمارے دامن میں لاکر ڈال دیئے ہیں انہوں نے علم دین کی اور انسانیت کی کیسی عظیم خدمت انجام دی ہے!!

اس کتاب کو کتبخانوں کے دفینوں سے باہر نکالنے اور اس کو ترتیب، تحشیہ اور تعلیق سے مزین کرنے کی ساری مشقت ہمارے مخدوم دوست مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اٹھائی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے کتاب کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کے متعدد نسخے، مختلف کتبخانوں سے جو انہیں میسر آسکے انہوں نے جمع کئے، ان کے باہمی مقابلہ سے کتاب کی تصحیح و تہذیب کی، نسخوں کے اختلاف کو نوٹ کیا، غلطیوں اور تصحیفات کی نشان دہی کی، مشکل الفاظ کی، جہاں کہیں ضرورت محسوس کی، تشریح کی۔ اصل مسندی فہرست کے ساتھ کتاب کی ایک فقہی فہرست مطالب کا اضافہ کیا، اور اسماء و اعلام کا ایک انڈکس لگایا۔ ہنگامہ پروری کے اس دور میں اب علم کی ایسی خاموش خدمتیں کرنے والے بہت کم رہ گئے ہیں، مولانا نے یہ خدمت انجام دے کر اپنا نام علم حدیث

کے زندہ جاوید خادموں کی فہرست میں شامل کرالیا ہے اور ایک نہایت قابل رشک سعادت حاصل کی ہے۔

مجلس علمی کراچی اور مجلس علمی، سملک ڈھابیل (بھارت) نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور انہی دونوں اداروں سے یہ مل سکے گی۔ قیمت کا علم باوجود تلاش کے نہ ہو سکا۔ لیکن ایسی چیزوں کے لئے قیمت کا کیا سوال ہے؟ یہ نعمتیں جان و دل کے عوض میں بھی میسر آئیں تو مفت ہیں۔ علمی اداروں، کتبخانوں اور اصحاب علم سے ہماری گذارش ہے کہ ایسی کوئی چیز جب بھی چھپ کر شائع ہو تو وہ خود بھی اس کی قدر کریں اور دوسروں کو بھی اس کی قدر کرنے پر حتی الامکان ابھاریں تاکہ ناشروں کی حوصلہ افزائی ہو ورنہ یاد رکھئے کہ ہمارے ملک میں ناولیں اور افسانے چھاپنے والے اداروں کے سوا کوئی ادارہ بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔

(۳)

اس دوران میں راقم سطور کی بھی ایک نئی کتاب چھپ کر مکتبہ میثاق میں آئی ہے۔ اس کا نام "اسلامی قانون کی تدوین" ہے۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے ملک کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں "اسلامی قانون کے ماخذ اور اس کی تدوین" کے عنوان سے متعدد لکچر دیئے تھے۔ یہ لکچر ایک تصنیف کا خاکہ سامنے رکھ کر دیئے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اہل علم میں بہت مقبول ہوئے تھے۔ یہی لکچر اب ایک کتاب کی شکل میں آگئے ہیں۔ میں نے اس میں ان تمام سوالات سے بحث کی ہے جو اس وقت ہمارے ملک کے مختلف طبقات میں اسلامی قانون سے متعلق چھڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسلامی قانون اور دنیوی قوانین میں بنیادی فرق کیا ہے؟ اسلامی قانون میں زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ حرکت اور تغیر کی صلاحیت ہے یا نہیں ہے؟ اگر ہے تو دونوں کی حرکت میں کیا فرق ہے اور معاشرہ اور تمدن پر اس کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں؟ اسلامی قانون کے ماخذ کیا کیا ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے کیا ہیں؟ فقہاء نے اسلامی قانون کے جو ماخذ بتائے ہیں کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی صحیح ترتیب کیا ہے؟ اجتہاد کے آداب و شرائط کیا ہیں؟ تقلید کو کن اسباب سے فروغ ہوا اور اب اس کی اصلاح کی صحیح راہ کیا ہے؟ اسلامی قانون کی تدوین کے لئے اب تک کیا کوششیں عمل میں آئیں اور ان کی ناکامی کے اسباب کیا ہیں؟ اس دور میں اسلامی

قانون کی تدوین کے لئے صحیح طریقہ کار کیا ہوگا اور اس کو کامیاب کرنے کے لئے کیا پیش قدمیاں ضروری ہیں؟

ان سارے سوالات سے میں نے بحث کی ہے اور ان تمام شبہات کے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو جدید قانونی نظریات کے اثر سے یا تجدد پسند طبقہ کی وسوسہ اندازیوں سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ سارے لکچر زیادہ تر لا کالجوں میں، جدید قانون کے ماہرین اور اس کے طلبہ کے سامنے دیئے گئے اور میں بلا شائبہ فخر کے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ ہر جگہ ان سے حاضرین نے غیر معمولی اثر قبول کیا اور ان کی افادیت کا پورا پورا اعتراف کیا۔

میں نے ان لکچروں میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ کسی وقتی تیاری کے نتائج نہیں ہیں بلکہ مدت العمر کے مطالعہ اور غور و فکر کے ثمرات ہیں۔ ان کی ترتیب کے وقت میں نے اصول قانون سے متعلق وہ نئی چیزیں بھی غور سے پڑھ لی تھیں جو پیش نظر مسائل کی توضیح کے لئے ضروری تھیں۔ انداز بیان میں نے ایسا سیدھا سادا رکھا ہے کہ ان شاء اللہ ایک اردو خواں بھی کتاب کو پڑھے گا تو ذہن پر کوئی گرانی نہیں محسوس کرے گا بلکہ محظوظ ہوگا۔

ہر مؤلف و مصنف کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کتاب اچھی چھپے۔ میرے اندر بھی یہ خواہش موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ میری کوئی کتاب ابتک ایسی نہیں چھپی جو میرے مذاق پر پوری اترتی ہو۔ ادھر تو میری بعض چیزیں ایسی غریبانہ چھپی ہیں کہ ان کو دیکھ کر مجھے اپنے حال پر ترس آنے لگتا ہے۔ البتہ یہ زیر نظر کتاب ایسی چھپی ہے کہ اس کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ کتابت، کاغذ، طباعت، جلد ہر چیز دیدہ زیب ہے۔ اس کو دیکھ کر بے ساختہ مرزا صاحب کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

یہ ہمارے برادر عزیز جناب حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی خوش ذوقی اور فیاضی کا کرشمہ ہے کاش اسی سلامت ذوق کے ساتھ میری تفسیر سورۂ بقرہ چھپ جاتی جو میثاق سائز کے سات آٹھ سو صفحات میں آئے گی۔ شاید کوئی اللہ کا بندہ اس نیک کام کے لئے بھی اٹھ کھڑا ہو۔

یہ کتاب مکتبۃ المنیر لائل پور اور مکتبۂ میثاق لاہور دونوں جگہ سے دستیاب ہو سکے گی قسم اول کی قیمت

تین روپے اور قسم دوم کی قیمت دو روپے ہے۔ میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے قسم اوّل کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ قسم دوم میری نظر سے نہیں گزری۔

(۴)

حلقہ تدبر قرآن میں جو طلبہ شامل ہوئے تھے اب انہوں نے اللہ کے فضل سے اپنے دوسرے سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ ان کے لئے عربی زبان اور قرآن و حدیث کا جو نصاب میرے ذہن میں تھا اس سے زیادہ انہوں نے کام کیا ہے جس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ شاید تین سال سے کم کی مدت میں وہ کام پورا ہو جائے جو ان کے لئے پیش نظر ہے لیکن اس معاملہ میں آخری فیصلہ کا انحصار دوسرے سال کے تجربات پر ہے۔

اب چونکہ ہمارے اپنے حلقہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نئے داخل ہونے والوں کو نحو اور زبان کی تعلیم ہمارے اپنے اصول کے مطابق بخوبی دے سکتے ہیں اس وجہ سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس سال دوسرے بیچ کے لئے کچھ طلبہ کا انتخاب کر لیا جائے۔ یہ طلبہ نحو اور ادب کی تعلیم تو الگ حاصل کرینگے جس کے لئے ہم انتظام کریں گے لیکن قرآن اور حدیث کے درس میں فی الحال پہلے ہی بیچ کے ساتھ شامل ہوں گے اور اگر کوئی طالب علم ایسا ہوگا جو مقدمہ ابن خلدون کے معیار کی عربی سمجھ سکتا ہوگا تو وہ بے تکلف پہلے بیچ میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس لئے کہ اب یہ بیچ مقدمہ شروع کر رہا ہے۔

جو لوگ اس بیچ میں شامل ہونا چاہتے ہوں وہ مندرجہ ذیل امور مدنظر رکھیں۔

- صرف وہی لوگ داخل ہونے کی خواہش کریں جو کالج یا یونیورسٹی کے مرحلہ سے گزر رہے ہوں یا گزر چکے ہوں۔
- جن کے سامنے "دین سیکھو اور سکھاؤ" کا نصب العین ہو اور وہ یہ پختہ عزم رکھتے ہوں کہ وہ زندگی بھر اس نصب العین کے لئے اپنے امکان اور اپنی صلاحیت کے حد تک کام کرتے رہیں گے۔
- اگر مرکز حلقہ تدبر قرآن یا اس کے زیر ہدایت کام کرنے والے حلقوں کو ان کی خدمات کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ حتی الامکان اس سے دریغ نہ کریں گے۔

○ حصول دین کی جدوجہد میں کسی ادنیٰ درجہ پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس میں تفقہ کا مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کرینگے اور اپنے تفقہ کے ثمرات و نتائج اردو، بنگلہ، عربی اور انگریزی میں عام کریں گے۔

○ موجودہ دور میں دین کے خلاف جو فتنے اُٹھ رہے ہیں ان کا علمی تجزیہ کریں گے اور عالمانہ بصیرت اور مومنانہ عزم کے ساتھ ان کا ہر محاذ پر مقابلہ کریں گے۔

○ زندگی میں محنت، کفایت شعاری، سادگی، تواضع اور خدمت کو اپنا شعار بنائیں گے اور دین کی خدمت حتی الامکان حسبۃً للہ کریں گے۔

○ اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں گے کہ دین سیکھنے کا اصلی مقصد اپنی اصلاح ہے۔ جب تک آدمی اپنی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتا آدمی کا علم بے ثمر ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے وہ نقصان اُٹھاتا ہے۔ اپنی اصلاح ہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی بھی اصلاح کی کوشش کرے اس سے خود اس کی اصلاح کو جلا حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی اصلاح سے غافل رہے گا وہ دوسرے کی اصلاح نہیں کر سکے گا۔

یہ چند باتیں ہم نے اس وقت محض اس لئے نوٹ کر دی ہیں کہ حلقہ میں نئے شامل ہونے والے طلبہ اس مقصد کو سمجھ کر اس میں داخل ہوں جس مقصد کے لئے یہ حلقہ قائم کیا گیا ہے۔ ابھی اس کے تعلیمی پہلو میں ہم بعض تجربات کر رہے ہیں ان سے فارغ ہوتے ہی اس کے تعلیمی و تربیتی دونوں ہی پہلوؤں کے تمام اصول و قواعد ان شاء اللہ ہم پوری وضاحت کے ساتھ قلم بند کر دیں گے تاکہ جو لوگ ان سے فائدہ اُٹھانا چاہیں وہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

(۵)

لوگ وقتاً فوقتاً ہم سے کسی ایسی تعلیم گاہ کے بابت مشورہ طلب کرتے رہتے ہیں جس میں وہ اپنے بچوں کو پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کے ساتھ اسلامی تعلیم و تربیت بھی دلا سکیں۔ ہم پورے اطمینان کے ساتھ ایسے لوگوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اجمل باغ رحیم آباد کے مدرسہ میں بھیجیں۔ یہ مدرسہ سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری نے قائم کیا ہے۔ وہی اس کے سرپرست اور نگران ہیں۔ یہ درسگاہ اقامتی ہے اور اس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی نہایت اہتمام

کے ساتھ اخلاقی اور مذہبی تربیت ہوتی ہے۔ اس کے اساتذہ اسلامی ذہنی کردار رکھنے والے ہیں۔ مڈل اور میٹرک کے امتحانات میں اس کے جو طلبہ شریک ہوتے رہے ہیں ان کے نتائج نہایت اچھے بلکہ شاندار رہے ہیں۔

یہ مدرسہ ایک نہایت پرفضا باغ میں ہے۔ قیام وطعام کا انتظام بھی نہایت اچھا ہے۔ اس وجہ سے صحت کے اعتبار سے اس مدرسہ کا ماحول معیاری ہے۔ مجھے شخصاً اس مدرسہ کو دیکھنے بلکہ اس کے طلبہ کو جانچنے کے بھی متعدد بار موقعے ملے ہیں۔ اس کے دینی ماحول سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں۔ اس کے مصارف بھی موجودہ زمانہ کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ غریب طلبہ کے لئے بعض رعائتیں بھی ہیں۔ جو حضرات اپنے بچے اس مدرسہ میں بھیجنا چاہیں وہ تفصیلات کے لئے سردار صاحب سے مذکورہ بالا پتہ پر مراسلت کر کے ضروری معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔

ہفت روزہ

المنبر

کی ہر سطر دعوت الی اللہ اور اظہار حق کے لئے وقف ہے

آپ المنبر کا مطالعہ فرمائیے **المنبر** کا ہر شمارہ اسلام کی بے لاگ اور فرقہ واریت سے پاک دعوت دیتا ہے۔ اسلام کے خلاف سازشوں کی بے نقابی کرتا ہے۔ اور دین میں تحریف وترمیم کے فتنہ کی سرکوبی اور اسلامیانِ عالم کو اسلام کے کلمہ جامعہ پر متحد کرنے کی مساعی کا حامل ہوتا ہے

طرز بیان شگفتہ اور استدلال واضح ہے۔

سوز وحرارت سے بھرپور مقالات "المنبر" کی خصوصیات ہیں۔

سالانہ چندہ: پانچ روپے ایک پرچہ: تیرہ نئے پیسے

پتہ:- ہفت روزہ "المنبر" پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۔ ۳۴۹ جناح کالونی لائلپور

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۳۲)

۶۴۔ الفاظ کی شرح اور جملوں کی وضاحت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ..... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ | صوم اور صیام مصدر ہیں۔ صوم کے لغوی معنی کسی شے سے رُک جانے اور اس کو ترک کرنے کے ہیں۔ صام الفرس صوما کے معنی ہیں گھوڑے نے چارہ نہیں کھایا۔ نابغہ کا شعر ہے۔

خیل صیام وخیل غیر صائمۃ تحت العجاج واخری تعلک اللجما

بہت سے بھوکے اور بہت سے آسودہ گھوڑے میدان جنگ کے غبار میں کھڑے تھے اور دُوسرے بہت سے اپنی لگامیں چبا رہے تھے۔

اسی سے صائم ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جو کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جائے۔ اس کے لئے کچھ مخصوص شرعی حدود و قیود ہیں جن کی تفصیل قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

"كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ" یعنی روزہ کی یہ عبادت صرف تمہارے ہی اُوپر پہلی بار فرض نہیں ہوئی ہے بلکہ تم سے پہلے دوسری اُمتوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ آسمانی شریعتوں میں یہ ابتدا سے تربیت نفس کی خاص ریاضت رہی ہے۔ مقصود اس بات کا حوالہ دینے سے صرف عام طبیعتوں کی گھبراہٹ دُور کرنا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، شرائع الٰہی کی یہ قدیم وراثت ہے جو تمہاری طرف منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کو اختیار کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ اہل اور حقدار ہو۔

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" یہ روزے کی اصل غایت بیان ہوئی ہے۔ تمام شریعت کی بنیاد تقویٰ پر ہے، تقویٰ پیدا ہوتا ہے جذبات وخواہشات پر قابو پانے کی قوت وصلاحیت سے اور اس قوت وصلاحیت کی سب سے بہتر تربیت روزوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ..... وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ..... اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "گنتی کے چند دن" یعنی روزے کی یہ مشقت تم پر کچھ زیادہ مدت کے لئے نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ سال میں صرف گنتی کے چند دن اس کے لئے خاص کئے گئے ہیں۔ جس طرح اوپر والی آیت میں "كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" کے الفاظ تالیف قلوب کے طور پر آئے ہیں۔ اسی طرح "اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" کے الفاظ بھی بطور تالیف قلب وارد ہیں کہ تربیت تقویٰ اور تزکیہ نفس کا یہ کورس چند روزہ ہے، اس سے پست ہمت اور دل شکستہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ نفس پر شاق ہونے والی عبادات کے بیان میں قرآن مجید نے تالیف قلب کا یہ انداز اکثر مقامات میں ملحوظ رکھا ہے۔ انفاق اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ آگے زیادہ واضح مثالیں اس کی آئیں گی۔

"گنتی کے چند دنوں" سے یہاں کیا مراد ہے؟ اہل تاویل کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد ہر مہینے میں تین دن کے روزے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہر ماہ میں یہی تین دنوں کے روزے فرض ہوئے تھے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد رمضان کے روزے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں فرض روزوں کی حیثیت سے صرف رمضان ہی کے روزوں کا علم ہے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے آنحضرت صلعم ہر ماہ میں جو تین دن کے روزے رکھتے تھے ان کی حیثیت فرض روزوں کی نہیں بلکہ نفلی روزوں کی تھی۔

امام ابن جریرؒ ان دونوں گروہوں کے اقوال نقل کر کے اپنی رائے دوسرے گروہ کے حق میں دیتے ہیں۔ ہمیں چونکہ ان کی اس رائے سے اتفاق ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک حق سے قریب تر بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ "اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" سے مراد ماہِ رمضان ہی کے ایام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قابلِ اعتماد

روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں پر رمضان کے روزوں کے سوا کوئی اور روزہ فرض کیا گیا ہو جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوا ہو۔ آیت کا سیاق خود اس بات پر دلیل ہے کہ جو روزے ہم پر فرض ٹھہرائے گئے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں، کوئی اور روزے نہیں ہیں۔ "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ" کے الفاظ خود ان ایام کا بلا کسی اشتباہ کے تعین کئے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ رمضان کے سوا کوئی اور روزے مسلمانوں پر فرض تھے، جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوئے، ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی روایت پیش کریں جو حجت بن سکے۔"

بارہ مہینوں میں سے صرف ۳۰ یا ۲۹ دن کے روزے، روزوں کی روحانی برکات کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی بڑی مدت نہیں ہے بلکہ گنتی کے چند دن ہی ہیں اس وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اصلاح نفس کے طالب اس مدت کو کوئی طویل مدت نہیں سمجھتے بلکہ نہایت قلیل اور چند روزہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے اس کی اس قدر و قیمت نیز تالیف قلب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو ایام معدودات سے تعبیر فرمایا۔

"وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ" کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ شروع شروع میں جب روزوں کا حکم نازل ہوا تو چونکہ اہل عرب اس سخت عبادت کے عادی نہیں تھے اس وجہ سے ان کی آسانی کے لئے یہ گنجائش رکھی گئی کہ جو شخص روزہ رکھنے کی قدرت کے باوجود روزہ نہ رکھنا چاہے وہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

اوّل تو روزے کی فرضیت کیا ہوئی جب کہ اس بات کی کھلی اجازت موجود تھی کہ کوئی شخص چاہے تو روزہ رکھے، نہ چاہے تو نہ رکھے، اس کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر روزے کے ابتدائی حکم کی نوعیت یہ تھی تو کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزے فرض کئے گئے) کا ٹکڑا بالکل غیر ضروری سا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی فرضیت بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ ایک طرف تو مریض اور مسافر دونوں کے

لئے دوسرے دنوں میں اپنے قضا کئے ہوئے روزوں کی تعداد روزے رکھ کر پورے کرنے کا حکم ہو، جیسا کہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کے الفاظ سے واضح ہے اور دوسری طرف یہ آزادی ہو کہ جو شخص چاہے روزے رکھے اور جو شخص چاہے مقدرت کے باوجود نہ رکھے، صرف ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مریض اور مسافر پر تو یہ پابندی ہے کہ وہ روزے ضرور رکھیں، یہاں تک کہ اگر سفر یا مرض کے سبب سے معین دنوں میں نہ رکھ سکیں تو دوسرے دنوں میں یہ گنتی ضرور پوری کریں درآنحالیکہ دوسروں پر کسی حالت میں بھی روزے رکھنا ضروری نہیں، ایک تندرست اور مقیم بھی چاہے تو روزے کا بدل ایک مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس مشکل سے بچنے کے لئے يُطِيقُونَهُ کے معنی یہ لیئے ہیں کہ جو لوگ مشکل سے طاقت رکھتے ہیں"۔ یہ معنی لے لینے سے اُوپر کے اعتراضات تو رفع ہو جاتے ہیں اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ الآیۃ کے ٹکڑے کا ایک محمل نکل آتا ہے لیکن اس صورت میں مذکورہ بالا اعتراضات سے بھی بڑا اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ "يُطِيقُونَهُ" کے یہ معنی لغت میں ہیں بھی یا محض اپنے جی سے گھڑ لیئے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک عربی لغت اس لفظ کے اس معنی سے بالکل خالی ہے۔ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے اس وجہ سے اطاقت کے معنی طاقت نہ رکھنے کے بھی آسکتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے تو انکار نہیں ہے کہ باب افعال کے خواص میں سے سلب ماخذ بھی ہے لیکن خاصیات ابواب کا معاملہ، جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، قیاسی نہیں ہے بلکہ سماعی ہے اس وجہ سے اصل شے لفظ کا استعمال ہے۔ اگر اہل زبان نے اس لفظ کو مذکورہ معنی میں استعمال کیا ہو اور اس کی مثالیں موجود ہوں تب تو بلاشبہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر اس معنی میں اس لفظ کے استعمال کی کوئی نظیر کلام عرب اور قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے تو محض اس مفروضہ پر کہ باب افعال کے خواص میں ایک خاصہ سلب ماخذ نامی بھی ہے لفظ کو اثبات کے بجائے نفی کے معنی میں لے لینا عربی زبان پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ چیز دین میں بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اگر کوئی صاحب اس اصول کو بے دھڑک استعمال کرنے لگ جائیں تو وہ دین کے ایک بہت بڑے حصہ کو بڑی آسانی سے امر و حکم کے بجائے نفی و نہی سے بدل سکتے ہیں۔

بعض کم سواد یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ "فلاں شخص فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہے" اس کے معنی ہی

یہ ہیں کہ وہ اس چیز کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل طفلانہ ہے اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیتے ہیں کہ طاقت رکھنے کے مفہوم میں مشکل کا یہ مضمون موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ طاقت آدمی کو تکالیف شرعیہ اور احکام دینیہ کے اُٹھانے کا ذمہ دار بناتی ہے یا اس کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بَری قرار دیتی ہے۔ جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ طاقت آدمی کو مکلف بناتی ہے نہ کہ اس کو بری قرار دیتی ہے۔ جب آپ یہ کہیں کہ میں فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہوں تو اس کے واضح معنی یہی ہیں کہ آپ اسکے لئے مکلف ہونے کے درجہ میں ہیں نہ کہ اس سے استثنا کے درجہ میں، قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی طاقت آسانی سے رکھتے ہیں یا مشکل سے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر کہنا یہ تھا کہ "جو لوگ روزہ رکھنے کی مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تو اس کے لئے عربی زبان میں بیسیوں اسلوب اور الفاظ نہایت معلوم و مشہور موجود ہیں جو اہل زبان استعمال کرتے ہیں آخر ان کو چھوڑ کر قرآن نے ایک ایسا لفظ کیوں استعمال کیا جس کا استعمال اس معنی کے لئے کسی کو معلوم نہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ "انا اطیق حمل السلاح" تو ہر شخص اس کا مطلب یہی سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اُٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مطلب تو کوئی بھی نہیں سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اُٹھانے کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے اس وجہ سے مستحق ہے کہ اسے جہاد کی ذمہ داریوں سے بری رکھا جائے۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ کہا جائے کہ "لنا طاقۃ بجالوت وجنودہ" تو اس کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ "ہمیں طاقت نہیں ہے، یا ہم مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تب تو قرآن میں بنی اسرائیل کا جو قول نقل ہوا ہے کہ "لاطاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ" اس میں لائے نفی کی مطلق ضرورت نہیں تھی بلکہ اثبات کی صورت میں ان کا مطلب صحیح طور پر ادا ہو جاتا۔

بہر حال جن لوگوں نے "یطیقون" کے یہ معنی لئے ہیں انہوں نے بالکل غلط معنی لئے ہیں لیکن یہ معنی اگر غلط ہیں تو اس کے معروف معنی لینے کی صورت میں آیت کی تاویل کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ٹکڑے میں جو اشکال ہے وہ یطیقون کے لفظ میں نہیں ہے، اس کے معنی تو وہی ہیں جو معروف و مشہور ہیں، اس کے سوا کسی اور معنی کے لئے اس لفظ میں کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں

ہے، دراصل اس میں اگر اشکال ہے تو یطیقونہ کی ضمیر مفعول میں ہے کہ اس کا مرجع کیا ہے؟ عام طور پر لوگ اس کا مرجع صوم کو مانتے ہیں اس وجہ سے وہ سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن اس کا مرجع صوم نہیں بلکہ طعام ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ یہ تاویل ہمارے پچھلے اہل تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے لی ہے اور یاد پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تاویل بھی یہی ہے۔ یہ تاویل ہمارے نزدیک بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے کہ طعام کا لفظ چونکہ اوپر کہیں مذکور نہیں ہوا ہے اس وجہ سے اس کے ذکر سے پہلے اس کے لئے ضمیر لانا اضمار قبل الذکر ہے، جو کلام کا ایک عیب ہے جس سے قرآن کو پاک ہونا چاہیئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اضمار قبل الذکر کلام کا ایک عیب ہے لیکن یہ عیب اس شکل میں ہے جب ضمیر کا مرجع متکلم کی نیت میں مقدم نہ ہو اور وہ اس کے لئے ضمیر لائے لیکن اگر مرجع متکلم کی نیت میں مقدم ہو اور محض تکرار سے بچنے کے لئے یا بلاغت کے کسی اور تقاضے کے تحت وہ مرجع کو موخر کرنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں اضمار قبل الذکر نہ صرف یہ کہ عیب نہیں ہے بلکہ کلام کی ایک خوبی ہے اور اس کی نہایت عمدہ مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ضمیر بھی جس کو ہمارے اہل نحو ضمیر شان کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اسی نوعیت کی چیز ہے۔ اس میں بھی متکلم ضمیر درحقیقت اس مرجع کے لئے لاتا ہے جو اس کے مافی الضمیر میں مضمر ہوتا ہے۔

یہاں پوری بات یوں تھی کہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَفِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں تو ان کے لئے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے) لیکن اس صورت میں جملہ نہایت ثقیل ہو جاتا تھا اس وجہ سے کلام کی روانی، ایجاز اور بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جگہ طعام مسکین کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لا دی جائے اور دوسری جگہ جہاں اس کا اظہار ناگزیر ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے تاکہ کلام غیر ضروری تکرار کے عیب سے پاک رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے اضمار قبل الذکر کی صورت تو ضرور پیدا ہوئی لیکن دیکھ لیجئے ضمیر اصلاً جس چیز کے لئے لائی گئی ہے وہ صرف عبارت میں مؤخر ہے متکلم کی نیت میں مؤخر نہیں ہے۔

اس تاویل کو قبول کر لینے کے بعد مسئلہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ پہلے جو روزے فرض ہوئے تھے اس میں اس بات کی بھی گنجائش تھی کہ اگر لوگ روزے نہ رکھنا چاہیں تو اس کا بدل

مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر دیا کریں بلکہ قرآن کے الفاظ سے اس کی اصلی شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ گویا اس وقت تک قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی، بعد میں یہ اجازت، جیسا کہ آگے والی آیت سے واضح ہوگا، منسوخ ہوگئی یعنی قضا شدہ روزوں کی جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری قرار دے دیا گیا۔

"جو کوئی از خود کچھ مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو یہ زیادہ بہتر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ قضا روزے کا یہ فدیہ جو مذکور ہوا، یہ ایک مستطیع سے کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ان کے ساتھ کوئی اور نیکی کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ نیز یہ کہ اس فدیہ کی نوعیت صرف ایک رخصت اور رعایت کی ہے، اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر یہی ہے کہ آدمی فدیہ کے بجائے دوسرے دنوں میں یہ روزے ہی پورے کر دے۔ یہ گویا اس رخصت کے ساتھ ساتھ ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ اجازت عارضی اور وقتی ہے جو منسوخ ہونے والی ہے اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ روزوں کی تعداد پوری کی جائے چنانچہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا اور آگے آرہا ہے، کچھ عرصے کے بعد یہ فدیہ کی اجازت منسوخ ہوگئی اور فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کا اصل حکم باقی رہ گیا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي ..... وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ | قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اوپر والی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی جس میں ایک حقیقت تو یہ واضح کی گئی کہ رمضان کے مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لئے کیوں منتخب فرمایا، دوسری یہ کہ اب تک سفر یا بیماری کے سبب سے قضا شدہ روزوں کے لئے فدیہ کی جو اجازت تھی وہ اجازت منسوخ ہوئی، اب روزوں کی تلافی روزوں ہی کے ذریعہ سے ضروری قرار دے دی گئی۔

پہلی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے کہ یہی مبارک مہینہ ہے جس میں دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس ہدایت کے متعلق فرمایا کہ یہ ہدایت بھی ہے اور اس میں ہدایت اور فرقان کی بینات بھی ہیں۔ یعنی یہ صراط مستقیم کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عقل کی رہنمائی اور

حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لئے وہ واضح اور قاطع حجتیں بھی اپنے اندر رکھتی ہے جو کبھی کہنہ ہونے والی نہیں ہیں۔ لفظ "ہدی" کی تحقیق اسی سورہ کی آیت ۲ کے تحت اور "فرقان" کی تحقیق آیت ۵۳ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ بینات سے مراد واضح، دل نشین اور ہر الجھن کو دور کر دینے والے براہین و حجج ہیں۔ قرآن صرف حلال و حرام بتانے کا ضابطہ ہی نہیں ہے بلکہ حجج و حکمت کے بینات کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ بھی ہے اس وجہ سے یہ رہتی دنیا تک عقل انسانی کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے کو روزوں کے لئے خاص فرما دیا تاکہ بندے اس میں اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اپنے قول و فعل، اپنے ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب ہر چیز سے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کریں کہ خدا اور اس کے حکم سے بڑی ان کے نزدیک اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

غور کرنے والے کو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آسکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے اس لئے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے ہی میں بھٹکتی رہتی ہے اس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اس کی شکر گزاری کا خاص مہینہ ٹھہرا دیا جائے تاکہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اس شکر گزاری اور تکبیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقاء کا انحصار ہے اور جس کے حاملین ہی کے لئے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے جیسا کہ اس سورہ کی بالکل پہلی ہی آیت میں اس نے خود یہ حقیقت واضح فرما دی ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ متقیوں کے لئے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا اس حکمت قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لئے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس

تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے اس وجہ سے رب کریم وحکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لئے خاص فرمایا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لئے بہار ہے اور رمضان کا مہینہ موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشوونما بخشتا ہے وہ تقویٰ کی فصل ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ یہ اُوپر کے مبتدا کی اصل خبر ہے۔ یعنی یہ مہینہ اپنی مذکورہ خصوصیات کی وجہ سے روزوں کے لئے منتخب کیا گیا ہے تو جو شخص اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس پورے ماہ کے روزے رکھے۔ حاضر ہونے کا مفہوم خود آگے کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ آدمی سفر یا بیماری کی حالت میں نہ ہو اور فَلْيَصُمْهُ کے معنی یہ ہوئے کہ اس پورے مہینہ کے روزے رکھے اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے اور اگر بیماری یا سفر کی وجہ سے روزے پورے نہ کر سکتا ہو تو دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر یہ کمی پوری کر دے۔ یہاں سے اُوپر والی آیت کے الفاظ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ، فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ حذف فرما دیئے جس کے معنی یہ ہیں کہ اصل حکم میں اس حصہ کے بقدر ترمیم ہو گئی۔ سفر یا بیماری کے زمانوں کے چھوٹے ہوئے روزوں کے لئے اب تک جیسا کہ اُوپر گزرا فدیئے کی بھی اجازت تھی، مذکورہ الفاظ کے حذف ہو جانے سے وہ ختم ہو گئی۔

آگے يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ سے آخر آیت تک صعودی ترتیب کے ساتھ اُوپر کے تمام احکام کی حکمت و مصلحت واضح فرما دی۔ اُوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں ان کو ایک مرتبہ پھر ذہن کے سامنے کر لیجئے۔ ایک تو یہ بات بیان ہوئی تھی کہ رمضان کا مہینہ روزوں کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا؟ دوسری یہ کہ فدیہ کی اجازت منسوخ کر دی گئی اب سفر اور بیماری کے زمانے کے روزوں کی تعداد بھی پوری کرنی ہوگی۔ تیسری یہ کہ سفر اور مرض کی حالت میں روزے دوسرے دنوں پر ملتوی کئے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں کی حکمت و علت نیچے سے شروع کر کے اُوپر کی طرف چڑھتے ہوئے یوں بیان فرمائی کہ سفر اور بیماری کی حالت میں روزے ملتوی کر دینے کی اجازت تمہیں اس لئے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ تمہیں کسی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا، فدیہ کی اجازت

اس لئے منسوخ کر دی گئی کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس خیر و برکت سے محروم نہ رہو جو اس کے اندر مضمر ہے اور رمضان کے مہینہ کو اس کے لئے مخصوص اس وجہ سے فرمایا کہ تم اس نعمت عظمیٰ پر اللہ کی بڑائی اور اس کا شکر کرو جو تمہیں قرآن کی صورت میں اس مبارک مہینے میں عطا ہوئی۔ اس ترتیب صعودی کی مثالیں سورہ قصص کی آیت ۴۳ اور انفال کی آیت ۱۱ میں موجود ہیں۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ میں تکبیر سے مراد خدا کی عظمت و جلالت اور اس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی وہ حالت ہے جو ایک روزہ دار پر روزے کی حالت میں عملاً طاری ہوتی ہے اور جس کے سبب سے بندہ اپنی تمام جائز خواہشوں سے بھی محض اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت پر مسلم کی اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "کل عمل ابن آدم یضاعف، الحسنۃ بعشر امثالہا الی سبع مأۃ ضعف، قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ، یدع شہوتہ وطعامہ من اجلی" ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا، دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا بدلہ دونگا کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ احادیث میں جو رخصتیں حاملہ، مرضعہ یا پیرفانی وغیرہ سے متعلق بیان ہوئی ہیں وہ تمام تر یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کے اصول یا اسی رخصت پر مبنی ہیں جو مریض و مسافر کے لئے بیان ہوئی ہے۔ قرآن حکیم کی حکمت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گوشوں میں بھی وسعت دے دی ہے جو اس کے دایرہ میں آتے تھے، جن لوگوں نے يُطِيْقُوْنَهٗ کے لفظ سے حاملہ یا مرضعہ وغیرہ کے لئے احکام نکالنے کی کوشش کی ہے انہوں نے دو بالکل غیر متعلق چیزوں میں جوڑ ملانے کا تکلف کیا ہے۔ ہم اوپر اس کی تردید کر چکے ہیں۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ ..... لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ یہ آیت تمہید ہے ان سوالوں کے جوابات کی جو روزے کے حکم کے نزول کے بعد ماہ رمضان کے احترام اور روزے کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے یا ان کی زبانوں پر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وضاحت

فرمائی۔ ایسے لوگوں کو قرآن نے یہ ہدایت فرمائی کہ اپنے اس قسم کے شبہات و اعتراضات کو خدا اور اس کی شریعت کی مخالفت یا اس کی تنقید و تضحیک کا ذریعہ نہ بنالیں بلکہ ان میں رہنمائی کی طلب کے لئے خدا ہی کی طرف رجوع کریں۔ جو آدمی اخلاص و صداقت کے ساتھ اپنی کسی حقیقی ضرورت کے لئے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے خدا اس کی طلب ضروری پوری کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ ضرورت اس کی معاش سے متعلق ہو یا معاد سے متعلق، ذہنی و عقلی الجھنوں سے متعلق ہو یا شریعت اور اس کے احکام کے فوائد و مصالح سے متعلق۔

منافقین کا حال یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو دین کی کسی بات میں کوئی مشکل محسوس ہوئی وہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اس بات کو اعتراض و استہزا کا نشانہ بنا لیتے اور مسلمانوں کے اندر وسوسہ اندازی اور فتنہ انگیزی کی ایک مہم شروع کر دیتے۔ قرآن میں ان کی اس خصلت کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے خاص طور پر سورۂ مجادلہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے ہیں۔ اہل ایمان کی پسندیدہ روش قرآن نے یہ بتائی کہ وہ اپنی مشکلات کے لئے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مشکلات دور فرما دیتا ہے۔

یہ تمہید ایک جامع تمہید ہے جو مختلف مواقع کے ساتھ مناسبت رکھنے والی ہے لیکن یہاں اس کا تعلق جیسا کہ ذکر کیا گیا خاص طور پر ماہ رمضان اور اس کے روزوں کے باب میں چند سوالوں کے جواب سے ہے۔ یہ سوالات مسلمانوں کے اندر جب پیدا ہوئے تو قرآن نے ان کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ہی ان کی حوصلہ افزائی کی کہ جب خدا اور اس کی شریعت سے متعلق کوئی سوال پیدا ہو تو اس کے لئے خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، خدا سب سے قریب ہے، اور وہ سب کی مشکلات حل فرماتا ہے۔

"وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ" "میرے متعلق سوال" سے مراد ضرور نہیں کہ خدا کی ذات و صفات ہی سے متعلق سوال ہو بلکہ یہ سوال اس کی ذات و صفات، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے احکام و شرائع سب ہی پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ سوال کا تعلق ان احکام سے ہے جو ماہ رمضان اور روزوں کے آداب و شرائط سے متعلق اصل حکم کے نزول کے بعد پیدا ہوئے۔ قرآن کے تدبر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس میں سائلوں کے سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل

ہوتے ہیں، سوال کی اصلی نوعیت اس جواب سے واضح ہوتی ہے جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ سوال کے اجمال کے ساتھ نقل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلام غیر ضروری طوالت سے محفوظ رہے، دوسری یہ کہ اکثر سوالوں کے جواب میں قرآن کی وضاحت صرف سوالوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ جب اس کا ابر کرم برسا ہے تو اس نے خشک و تر سب ہی کو سیراب کر دیا ہے۔ جواب کی اس وسعت و ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہوا ہے کہ سوال مبہم شکل میں نقل کیا جائے تاکہ سوال اور جواب میں عدم مطابقت نمایاں نہ ہو اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لئے موزوں مواقع آگے آئینگے اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

"فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ" ایک حقیقت کا اظہار ہے اس لئے کہ خدا سے قرب و بعد کا انحصار بندے کے اپنے دل کی حالت پر ہے۔ اگر بندہ خدا سے غافل اور بے پروا رہے تو اس سے زیادہ دور کوئی چیز بھی نہیں لیکن اگر وہ خدا کی طرف متوجہ رہے، اس کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر گزار رہے اور اس کی آزمائشوں میں طلب صبر و استقامت کے لئے اسی کے آگے روئے اور گڑگڑائے تو خدا سے زیادہ قریب بندے سے کوئی چیز بھی نہیں۔ وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ قربت بندوں کو یوں تو ہر حال اور ہر مقام میں حاصل ہے لیکن خاص کر نبی کی بعثت کا زمانہ تو جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، خدا سے قرب و اتصال کا خاص زمانہ ہوتا ہے۔ نبی خدا کا نائب اور بندوں کا وکیل ہوتا ہے، خدا کے فرشتے ہر وقت اس کے پاس آتے رہتے ہیں، وحی کا سلسلہ اسکے اور خدا کے درمیان قائم رہتا ہے، بندے اپنی جو مشکلات اور اپنے جو سوالات نبی کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ گویا اس کے واسطے سے اپنے رب کے حضور ہی میں پیش کرتے ہیں اور وحی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے ہر لمحہ توقع ہوتی ہے کہ جو سوال اس کے حضور میں پیش ہوا ہے اس کا جواب نازل ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف مائدہ کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۱۰۱) اور اگر تم ان کی بابت اس زمانے میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ بھی ایک حقیقت کا بیان ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ جواب دینے سے مراد قبولیت کا جواب ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ بندہ اپنے رب کو پکارے اور وہ اس کی مدد، فریاد رسی اور داد رسی کو نہ پہنچے۔ شرط صرف

یہ ہے کہ بندہ اخلاص و تضرع کے ساتھ پکارے اور اسی چیز کے لئے پکارے جس کے لئے پکارنا اس کو زیبا ہے۔ اگر بندہ اپنے رب سے وہ چیز مانگتا ہے جو مانگنے کی ہے اور اس طرح مانگتا ہے جس طرح مانگنا چاہیئے تو وہ چیز اس کو ضرور عطا ہوتی ہے، اگر فوراً عطا نہیں ہوتی تو اس کے مستقبل کے لئے یا اس کی آخرت کے لئے خدا کے ہاں محفوظ ہو جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ملتی جس شکل میں اس نے مانگی ہے تو اس سے بہتر شکل میں وہ اس کو مل جاتی ہے یا اس کے لئے محفوظ کر دی جاتی ہے۔ قبولیت دعا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص سنت ہے جس کے مختلف اجزاء اپنے اپنے مقامات میں بیان ہوں گے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

'فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي'، اوپر اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں یہ ان کا لازمی تقاضا یا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ بندوں سے قریب تر بھی ہے اور وہ ان کی پکار سنتا اور اس کا جواب بھی دیتا ہے تو پھر اسی کا حق ہے کہ سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس پر ایمان لائیں، پھر اس سے منحرف ہو کر کسی اور کی طرف رُخ کرنے کے لئے کوئی ادنیٰ وجہ جواز بھی نہیں ہے۔ خاص کر یہ تو اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ہے کہ جو پروردگار اپنی شریعت کے اجمالات کی توضیح خود فرمانے کیلئے سراپا رحمت و کرم ہے اس کے کسی حکم کو کوئی اعتراضات و شبہات کا ہدف ٹھہرالے یا اس کے سبب سے کسی خیانت یا تنگی میں مبتلا ہو۔

اس آیت کے سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اہل ایمان کی اس بات کے لئے حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے کہ اگر ان کو خدا اور اس کی شریعت کے باب میں کوئی کھٹک پیدا ہو تو وہ خدا اور اس کے رسول ہی کی طرف رجوع کریں، اللہ تعالیٰ ان کی کھٹک دُور فرمائے گا۔ بظاہر یہ بات اس ہدایت کے خلاف معلوم ہوتی ہے جو لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ اور اس کی ہم معنی دوسری آیات میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ جہاں سوالات کرنے کی ممانعت ہے وہاں اس سے مراد اس طرح کے غیر ضروری سوالات ہیں جو یہود اپنے پیغمبر سے محض ان کو زچ کرنے اور شریعت سے فرار اختیار کرنے کے لئے کرتے تھے۔ وہ سوالات اس کے تحت نہیں آتے جو شریعت کی توضیح و تبیین کے لئے ضروری ہیں۔ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور ان کے جوابات سے دین کی دولت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے

کہ اللہ اور رسولؐ نے ایسے سوالات کے مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ لوگوں پر دین کی حکمتیں اور مصلحتیں اور بندوں کی ضروریات کے ساتھ شریعت کی مناسبتیں واضح ہوں۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ ..... كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ | اُوپر کی تمہید کے بعد اب یہ ان سوالات کا جواب ہے جو روزے کے احکام و آداب سے متعلق اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے۔ اس کے آخر میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ کے الفاظ اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ آیت اصل حکم کے نزول کے کچھ عرصہ بعد توضیح و تبیین کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ جو لوگ قرآن مجید کے انداز بیان سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں قرآن میں جب کسی حکم کے بعد اس کی کوئی مزید توضیح و تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے ساتھ بالعموم یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم بعد میں بطور وضاحت نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن سے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جس کا ذکر سورہ قیامہ میں ہوا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۔ 'رَفَث' کے اصل معنی تو شہوانی باتوں کے ہیں لیکن یہاں اس کے بعد اِلٰی کا صلہ اس کے اندر بیویوں سے اختلاط و ملاقات کا مضمون پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے جائز کر دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی تھی بعد میں یہ جائز کر دی گئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی حکم میں اس قسم کی کوئی وضاحت چونکہ موجود نہیں تھی اس وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے بنظر احتیاط و تقویٰ یہ سمجھا کہ جس طرح روزے کی حالت میں، دن میں زن و شوہر کے تعلقات کی اجازت نہیں ہے اسی طرح شب میں بھی اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچی ہوگی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے بعد معاً پھر شروع ہو جاتا تھا جس کے سبب سے انہیں شب میں بھی وہ پابندیاں نباہنی پڑتی تھیں جو دن میں تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کے سامنے عملی مثال کی حیثیت سے اہل کتاب ہی کا روزہ تھا اور قرآن میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تھا اس وجہ سے انہوں نے از خود اپنے اُوپر یہ پابندی عاید کر لی کہ دن کی طرح شب میں بھی ازدواجی تعلقات سے احتراز کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں چونکہ اب تک کوئی واضح ہدایت نہیں تھی اس وجہ سے اس کی نوعیت ایک مشتبہ معاملہ کی تھی۔ اس اشتباہ کے سبب سے بعض لوگ نفس کی

اکساہٹ کے باعث کبھی کبھی اس چیز کے مرتکب بھی ہو جاتے جو خود انکے ضمیر کے نزدیک مشتبہ تھی مشتبہ معاملات میں شریعت کی ہدایت ، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے ، یہ ہے کہ "دع ما یریبک الی مالا یریبک" ، مشتبہ کو چھوڑ کر آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جو غیر مشتبہ ہو ، اگر اس کے برعکس آدمی مشتبہ پہلو کو اختیار کرے تو یہ خود اپنے نفس کے ساتھ ایک قسم کی خیانت ہوتی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا لیکن چونکہ یہ احتیاط شریعت کے منشا کے خلاف تھی ، محتاط مسلمانوں نے از خود اپنے اُوپر عائد کر لی تھی ، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگزر فرمایا اور واضح الفاظ میں شب میں بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

" ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ " (وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو) میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے ہیں ، یہ اس کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے یہ بتانا ہے کہ ان دونوں میں ایسا چولی دامن کا رشتہ ہے اور یہ باہمدگر ایسے فطری تقاضوں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے ۔ اس وجہ سے دین فطرت نے ان کے باہمی تعلق پر کوئی ایسی پابندی عاید نہیں کی ہے جو فطری داعیات کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کر دے ۔ اگر کوئی محدود قسم کی پابندی خاص خاص حالات میں عائد بھی کی گئی ہے تو وہ صرف تربیت نفس کی ضرورت کی حد تک ہے ، ذرا بھی اس سے متجاوز نہیں ہے ۔

میاں اور بیوی کے لئے لباس کا استعارہ ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے ۔ اس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے ۔

لباس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے جسم کے لئے ساتر ہوتا ہے اس سے اس کے عیوب برہنگی کو پردہ پوشی نصیب ہوتی ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی ننگا ہو کر حیوانات کے درجے میں آجائے ۔ ٹھیک اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے جنسی جذبات و داعیات کے لئے پردہ فراہم کرتے ہیں ۔ ان کے اندر جو صنفی میلانات ابھرتے ہیں وہ ان

کی تسکین اور آسودگی کے لئے خود اپنے اندر سامان رکھتے ہیں اس وجہ سے کبھی ان کے عریاں اور بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ اگر یہ نہ ہو تو جذبات کا ہیجان جنسی آثار کی کا ایک ایسا طوفان برپا کر دے کہ کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔ جسم کے جو حصے اپنے اندر جنسی کشش رکھتے ہیں وہ عریاں ہونے کیلئے زور لگائیں۔ زبان اور قلم پر فحاشی کا بخار و ہذیان طاری ہو جائے، دل ہرزہ گرد اور نگاہ بالکل آوارہ ہو کر رہ جائے۔ ہمارے نفس کے ان سارے عیوب کی پردہ پوشی اگر ہو سکتی ہے تو صرف بیوی کے لئے شوہر کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور شوہر کے لئے بیوی کے ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کو باحیا بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز نکاح کو قرار دیا ہے۔ حیا کے متعلق معلوم ہے کہ وہ خود ایک باطنی لباس ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اصلی لباس یہی ہے، باطن کا یہی لباس ہے جس کے سبب سے ہم ظاہر کے لباس کو اختیار کرتے ہیں اور حیا کے قائم رکھنے میں جو مدد شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ملتی ہے وہ کسی چیز سے بھی نہیں ملتی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ زینت ہے۔ یہ درجہ ستر پوشی کے بعد کا ہے۔ انسان لباس کے ذریعہ سے آرائش، حسن و جمال اور تہذیب و سلیقہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے اور تمدن ترقی کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ غور کیجئے تو یہی چیز اس سے بلند تر درجے میں عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ انسان نے تہذیب و تمدن کا پہلا قدم اسی دن اٹھایا جس دن پہلے مرد نے پہلی عورت سے اپنا تعلق استوار کیا۔ یہ بات اپنے اندر ایک بہت بڑی حقیقت رکھتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ مرد کے اندر گھر در کی خواہش، تجمل و تزین کا جذبہ، حصول مال و جائیداد کا ولولہ اصلاً عورت کے تعلق ہی سے پیدا ہوا، بعد میں دوسرے عوامل کی شرکت سے اس میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح عورت کی زینت و آرائش، اس کے سگھڑپن اور سلیقہ اور اس کی گھرداری کے جوش و انہماک میں اصلی دخل مرد کی تسخیر کی خواہش کو ہے۔ عورت اور مرد میں سے کوئی بھی اگر اپنے اس فطری محرک سے محروم ہو جائے تو ان کے تمام مذکورہ جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ مرد اگر بیوی سے محروم ہو تو ایک مسافر بلکہ کچھ خانہ بدوش سا بن کے رہ جاتا ہے، اسی طرح عورت اگر شوہر سے جدا یا

اس سے محروم ہو تو اس کے سارے احساسات مردہ اور اس کے سارے اسلحہ زنگ آلودہ اور کند ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ مرد اور عورت کا باہمی ارتباط و تعلق ہی ہے جس کے صدقے میں گھریلو زندگی کی وہ تمام رونقیں اور بہاریں ہمیں نصیب ہوتی ہیں جن سے دنیا میں تہذیب و تمدن پروان چڑھے ہیں۔

لباس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ سردی اور گرمی کی سختیوں اور دشمن کے بہت سے خطرات سے آدمی کو محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمہیں حملہ سے محفوظ رکھے) اخلاقی پہلو سے ٹھیک یہی حال عورت کا مرد کے لئے اور مرد کا عورت کے لئے ہے۔ عورت مرد کے لئے زرہ اور بکتر ہے اور مرد عورت کے لئے زرہ اور بکتر ہے۔ جب یہ دونوں اپنے اپنے زرہ و بکتر سے آراستہ اور مسلح ہوں تو شیطان کے حملے ان میں سے کسی پر بھی کارگر نہیں ہوتے اور اگر وہ اس لباس سے عاری ہوں تو دونوں ہی کے لئے شیطان سے مار کھا جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ بیوی کو سفر و حضر میں گلے کا تعویذ بناؤ تاکہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو۔

لباس کے یہ تینوں مقصد قرآن میں مذکور ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی اعتبارات سے عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے لباس کی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے اسلام نے، جو دینِ فطرت ہے، ان کے تعلق کی اس فطری اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے اور اس کو نہ صرف یہ کہ تقویٰ کے خلاف نہیں قرار دیا بلکہ جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا، اس کو مختلف اعتبارات سے تقویٰ کا معاون قرار دیا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں مسلمانوں نے غلط فہمی کے سبب سے، یا اہل کتاب کے طریقہ سے متاثر ہو کر، اپنے اوپر اس سلسلہ میں جو پابندی عاید کر لی تھی اس آیت کے ذریعہ سے وہ دور فرما دی گئی۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض لوگوں نے یہ گمان رکھتے ہوئے کہ رمضان میں دن کی طرح راتوں میں بھی ازدواجی تعلقات جائز نہیں ہیں، اس کی خلاف ورزی کی۔ اس چیز کو قرآن نے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ مشتبہ معاملات میں آدمی کو وہ پہلو اختیار کرنا چاہیئے جس

میں احتیاط ہو۔ اور پھر اسی کا التزام کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز اس کے اجتہاد یا گمان میں حکم شریعت ہے (اگرچہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم نہ ہو) اس نے اس کی خلاف ورزی کی اور یہ چیز واضح طور پر اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت ہے۔ ہمارے نزدیک یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر ایک چیز اس کے اجتہاد کی رو سے صحیح ہے تو پھر اس کی خلاف ورزی اس کے لئے درست نہیں ہے الا آنکہ دین ہی اس کے لئے متقاضی ہو ——— مگر یہ پابندی چونکہ منشائے الٰہی کے خلاف تھی اس وجہ سے اس خیانت پر اللہ تعالیٰ نے گرفت تو فرمائی لیکن ساتھ ہی معاف بھی فرما دی اور آئندہ کے لئے واضح الفاظ میں بیویوں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (اور اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو) یعنی اولاد جو ازدواجی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کے طالب بنو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اس چیز کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے نہ کہ تمہارے اختیار یا اللہ کے سوا کسی اور کے تصرف پر۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی اصل غایت صرف لذت نہیں ہے بلکہ بقائے نسل ہے جو عین منشائے الٰہی ہے۔ اگر آدمی صرف لذت کے درپے ہو تب تو اس کا چھاپ انسان پر برا پڑ سکتا ہے لیکن اگر نگاہ اصلی غایت پر ہو تو یہ بھی عبادت ہی میں داخل ہے۔ اس زمانے میں ضبط ولادت کی تحریک اس کے بالکل برعکس ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کی تو بیخ کنی کر رہی ہے اور لذت کو اصل مقصد کی اہمیت دے رہی ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ (کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے) یہ چیز ہمارے روزوں کو اہل کتاب کے روزوں سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں رات کو اٹھ کر کھانے پینے یا ازدواجی تعلقات کی اجازت نہیں تھی اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی بلکہ اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے، اسی بات کی تائید احادیث اور صحابہؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے اس وجہ سے محض احتیاط میں غلو کے سبب سے اپنے یا دوسروں کے روزے مخص معمولی تقدیم و تاخیر پر مشتبہ

قرار دے بیٹھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اس قدر واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے دور میں ان کا مفہوم سمجھنے میں بعض لوگوں کو زحمت کیوں پیش آئی؟ عدی بن حاتمؓ کی روایت جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہے کہ انہوں نے فجر کو پہچاننے کے لئے دو سیاہ و سفید دھاگے باندھ لئے اگر پوری طرح قابل اعتماد ہے تو اس کو محض ان کی اس شدت احتیاط پر محمول کرنا چاہیئے جو نئے نئے اسلام لانے والوں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی باتوں کو صحابہؓ کی فہم و بصیرت پر طعن کا بہانہ نہیں بنانا چاہیئے۔

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ 'عکف' کے اصل معنی اپنے آپ کو کسی چیز سے روک لینے یا کسی چیز پر جما دینے کے ہیں۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد ہر چیز سے الگ ہو کر یاد الٰہی کے لئے گوشہ نشین ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو اعتکاف کہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ رمضان کے مہینے اور مسجد سے اس عبادت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اعتکاف سے مقصود چونکہ تَبَتُّلٌ اِلَی اللہ ہے اور اس میں دل کی کامل یکسوئی مطلوب ہے، نیز مسجد کا قیام اس کے لوازم میں سے ہے اس وجہ سے اس کے دوران میں بیویوں سے زن و شوہر کا تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا۔ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے نفس کی آزادی کے لئے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کی پوری احتیاط سے نگرانی کرنی چاہیئے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ان سے بچائے رکھنے کے لئے ذرا ان سے دور ہی دور رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ جو جانور کسی چراگاہ کے بالکل پاس پاس چرتا ہے اس کے متعلق بڑا اندیشہ ہے کہ وہ چراگاہ کے اندر جا بڑھے۔

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ۔ ہم اوپر یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی حکم کے نزول کے بعد لوگوں کے سوال پر یا محض حالات کے اقتضا کے تحت اس حکم ہی کے متعلق کچھ مزید تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے بعد بالعموم یہ آیت آئی ہے۔ اسی سورہ میں اس کی بعض مثالیں آگے آ رہی ہیں اس وجہ سے ہم یہاں اسکے نظائر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس قسم کی تفصیلات سے چونکہ تقوٰی کے طالبوں کیلئے تقوٰی کی مزید راہیں کھلتی ہیں اس وجہ سے فرمایا کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ تاکہ وہ تقوٰی اختیار کریں۔

۶۶۔ روزے کا اثر انسان کی صلاحیت کار پر

اس زمانہ میں جو لوگ مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفۂ زندگی سے متاثر ہیں وہ روزے کے خلاف یہ اعتراض اُٹھاتے ہیں کہ اس سے انسان کی صلاحیت کار اور اس کی قوت کارکردگی بہت کم ہو جاتی ہے جس سے فرد اور معاشرہ دونوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کرنے والے دو بنیادی حقیقتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں انسان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے وہ محض اس کے مادی وجود کی ہے، اس کے روحانی وجود کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ایک فربہ بیل زیادہ ہل چلا سکتا ہے اسی طرح ایک آسودہ اور پیٹ بھرا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا مسیحؑ کی اس حکمت سے بالکل ناآشنا ہیں کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے"، اسی طرح یہ لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل بے بہرہ ہیں جس کی طرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے کہ انی ابیت لی مطعم یطعمنی وساقٍ یسقینی۔ میں اس حال میں رات گذارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔

انسان اگر صرف گوشت پوست کا مجموعہ ہے تب تو بلاشبہ ان معترضین کے اعتراض کے اندر کچھ وزن ہے لیکن اگر انسان کے اندر روح نامی کوئی شے بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی تازگی و توانائی کے لئے بھی کوئی غذا اور تدبیر ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کیا یہی دودھ مکھن جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اس کے لئے بھی کافی ہیں یا اس کے لئے کسی اور تدبیر و غذا کی ضرورت ہے؟ مذہب اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان کے اندر روح کا جوہر ارضی نہیں بلکہ آسمانی اور خدائی ہے اس وجہ سے اس کی غذا اس زمین سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق و توصل اور اس کے کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق خدا سے قریب تر اور قوی تر اس وقت ہوتا ہے جب یہ جسم کے (جو اس کے لئے صرف ایک مرکب کی حیثیت رکھتا ہے) تقاضوں، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات و میلانات سے فی الجملہ آزاد ہوتی ہے۔ جب تک یہ انہی سفلی پابندیوں میں گرفتار رہتی ہے اس وقت تک یہ ان بلندیوں پر پرواز نہیں کر سکتی جو اس کی فطرت

کے لحاظ سے اس کی اصلی جولانگاہ ہیں اور جن میں پرواز کرنے ہی سے اس کے وہ شاہینی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

روزہ رُوح کو یہ آزادی دلانے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کے نفس کی جو تربیت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ روح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہے، انسان کی قوت ضبط اور اس کی قوت ارادی مضبوط ہو جاتی ہے، اور اس طرح اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلے وہ ایک صاحب عزم و ایمان کی طرح اپنی خواہشات و جذبات کو اپنے رب کی رضا اور اس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

غور کیجئے تو یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ انسان کے اندر قوت اور طاقت کا اصلی خزانہ اس کے جسم کے اندر نہیں بلکہ اس کے دل اور اس کی روح کے اندر ہے۔ اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو نہایت راحت و تنعم میں پلے ہوئے جسموں کا حال یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ لکڑی کے کندے ہیں جن کو خوبصورت پوشاک پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ان کے خوف و بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ، دُنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو، ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے۔ برعکس اس کے جن کی رُوح بیدار، جن کے دل پُرعزم اور جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں وہ نان جویں پر گزارہ کر کے بھی بازوئے حیدرؓ کے کارنامے دکھاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ کتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔ اور اسی چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دوسری حقیقت جس سے یہ معترضین غفلت برت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے وقتی اثرات و نتائج سے نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ اس مستقل اور پائیدار اثر سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے جو زندگی پر اس کا پڑتا ہے یا متوقع ہوتا ہے بشرطیکہ صحیح طور پر اس

کو برتا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دوا تقویت قلب و دماغ کے لئے نہایت مفید و مجرب ہو، اس کے اثرات نہایت پائیدار مترتب ہوتے ہوں لیکن فوری طور پر اس کا عمل سستی یا اعضا شکنی یا خمار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دوا کے اس فوری اثر کو دلیل قرار دے کر اس کو ایک مضر یا بے قیمت دوا قرار دے دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

ٹھیک یہی حال روزے کا ہے۔ اس کا فوری اثر ـــــ خاص طور پر خام اور نو مشق لوگوں پر ـــــ تو ضرور کسل اور اضمحلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے وقتی طور پر ان کی صلاحیت کار بھی متاثر ہوتی ہے لیکن دیکھنے کی چیز اس کا یہ وقتی اثر نہیں ہے بلکہ وہ پائیدار اثر ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر (بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک برتا جائے) اس کا مترتب ہوتا ہے۔

روزے کے لئے عربی میں، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، صوم کا لفظ ہے۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ ابتداءً یہ لفظ ان گھوڑوں کے لئے استعمال ہوا جن کو جوانی پر آنے کے بعد، جنگ کے لئے تیار کیا جاتا اور اس تیاری کے لئے بالتدریج ان کا چارہ اور دانہ پانی کم کیا جاتا تاکہ ان کا بدن بھاگ دوڑ کے لئے سبک نکل آئے اور وہ میدان جنگ کی سختیوں اور بھوک پیاس کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے اچھی طرح قابل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ گھوڑوں پر یہ عمل اس لئے نہیں کیا جاتا تھا کہ اس سے ان کی قوت کارکردگی کم ہو جائے بلکہ مقصود اس سے ان کی قوت کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے مقصد تخلیق کے لئے پوری طرح کارآمد ہو جائیں۔ ایک پلے ہوئے گھوڑے پر اگرچہ اس ٹریننگ کا فوری اثر اچھا نہیں پڑتا، وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے، لیکن ٹریننگ دینے والے اس کے اس پائیدار اثر کو نگاہ میں رکھتے ہیں جو گھوڑے کو ہر سختی و نرمی کے برداشت کے قابل بنا دیتا ہے اور جس سے وہ تھان پر بندھے ہوئے ایک پرخور جانور کے بجائے میدان جنگ کا ایک سخت کوش اور جاں باز سپاہی بن جاتا ہے۔

یہی صوم (روزہ) ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لئے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیت کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ اس صلاحیت کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل

ہیں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کئے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدود الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے اپنے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اُٹھائیں ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے رمضان کے مہینہ میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو لیکن دیکھنے کی چیز یہ فوری اثر نہیں بلکہ اس کا مستقل اثر ہے۔ اس کا مستقل اثر یقیناً اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں یہی ہونا چاہیئے کہ انسان کی بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو، اس کا دل توانا ہو، اس کی قوت ارادی مضبوط ہو، اس کی قوت برداشت بڑھ جائے، وہ جہاد زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے پوری طرح تیار ہو جائے۔

غور کیجئے کہ یہ انسان کی صلاحیت کار کا گھٹنا ہے یا بڑھنا؟ ہمارے نزدیک تو جن کے اندر یہ صفات ہوں وہی درحقیقت انسانیت کے گل سرسبد ہیں۔ جن میں یہ صفات نہیں وہ آدمی نہیں بلکہ گاؤ پرواری ہیں۔

کیا

○ اسلام آج کی دنیا میں بحیثیت نظام رائج ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟
○ کیا اسلامی قانون کی تدوین ممکن ہے؟ اور مسلمان جو متعدد اور باہم متصادم فرقوں اور گروہوں میں منقسم ہو چکے ہیں کیا اسلامی قوانین کے ایک ہی مجموعے پر متحد و متفق ہو سکتے ہیں؟

ان سوالات کے جواب آپکو اسلامی قانون کے ماہر اور قرآنی علوم کے غواص عالم دین مولانا امین احسن اصلاحی کی تازہ ترین تالیف

"اسلامی قانون کی تدوین" میں ملیں گے

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۳ روپے سستا ایڈیشن ۲ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ المنبر پوسٹ بکس ۱۷۱ لائلپور

افادات فراہیؒ

جناب خالد مسعود صاحب ایم ایس سی

احکامِ شریعت کا مقصد اور اصولِ تشریع

(۲)

اس مضمون کی پہلی قسط میثاق کے گزشتہ شمارے میں شائع ہوئی تھی جس میں احکام شریعت کی دو قسمیں بیان ہوئی تھیں، ایک مقصود بالذات احکام اور دوسرے آزمائش کے لئے نازل شدہ احکام۔ اس مضمون کو گذشتہ قسط کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ (خ۔م)

احکام شریعت سد ذریعہ کے لئے شریعت کے جو احکام مقصود بالذات نہیں ہیں ان میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جو سد ذریعہ یعنی ناجائز کاموں کی طرف لے جانے والی چیزوں پر پابندی لگانے کے لئے نازل ہوئے۔ ان میں کچھ تو اسی وقت منسوخ ہو گئے جب ان کے اتارنے کا منشاء پورا ہو گیا جیسے حرمتِ شراب کا حکم نافذ ہو جانے کے بعد شراب کے برتنوں کے استعمال کی حرمت منسوخ ہو گئی۔ لیکن بعض احکام ضرورت باقی رہ جانے کی وجہ سے باقی رکھے گئے مثلاً بیع فضل یعنی ایسی تجارت کی ممانعت کا حکم جس میں ایک فریق ایک چیز خرید کر وہی چیز بدلے میں مقدار سے زیادہ دے۔ یہ حکم اب تک باقی ہے تاکہ لوگ تجارت کی اس شکل سے بچتے رہیں۔ لہٰذا یہ تجارت صرف اس وقت جائز ہو گی جب سرے سے اس کی شکل بدل دی جائے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک اچھی چیز کو نقدی کے عوض فروخت کر کے اس کی رقم سے اسی جنس کی ایک کمتر چیز خرید کر نفع حاصل کرنا جائز ہے۔

لیکن وہ چیز جس کی حقیقت کو حرام ٹھہرایا گیا ہو محض اپنی صورت کے تبدیل ہونے سے جائز نہیں ہو سکتی کیونکہ شریعت محض کسی صورت کو حرام نہیں کرتی بلکہ اس کو حرام اس علت کی وجہ سے کرتی ہے جو اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور آپ کے مکی ساتھیوں نے اس حکمت کا ایک پہلو تو نگاہ میں رکھا مگر دوسرے پہلو کو انہوں نے اہمیت نہ دی۔ چنانچہ انہوں نے

دو صاع کے بدلے ایک صاع کی دست بدست فروخت کو جائز قرار دیا اور اپنے اس فیصلہ کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر رکھی کہ

انما الربا فی النسیئۃ — سود اُدھار میں ہوتا ہے۔

ان کا خیال یہ ہُوا کہ حضورؐ نے اپنے اس ارشاد میں سود کی حقیقت اور اس کی حرمت کی علت بیان فرمائی ہے۔ حالانکہ حضورؐ نے یہاں سود کی اسی قدر حقیقت بیان فرمائی جس قدر عموماً واقع ہوتی ہے۔ خریدار نقصان اسی وقت اُٹھاتا ہے جب اس کے ہاتھ میں قیمت ادا کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ ایک چیز ادھار لے لیتا ہے اور اس کے عوض رائج قیمت سے زیادہ قیمت کی ادائیگی کر دیتا ہے۔

لیکن جب معاملہ دست بدست ہو تو اول تو ایک ہی طرح کی دو چیزوں کی خرید و فروخت ہونا ہی بے معنی ہے، دوسرے مبادلہ میں ایک فریق کے زیادہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک ان میں ایک کی چیز دوسرے کی چیز سے بڑھیا نہ ہو۔ چونکہ اس مبادلہ میں سُود کی کیفیت پیدا ہونے کا احتمال موجود تھا اس لئے حضورؐ نے اس قسم کی تجارت ہی سے منع فرمایا اور اس کا حل یہ پیدا کر دیا کہ چیز کی قسم تبدیل کرنے کا حکم دیا مثلاً دست بدست تجارت میں سونے کی چاندی سے اور چاندی کی سونے سے خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس خاص پہلو کو اہمیت نہ دینے کے باعث سونے یا چاندی کی بنی ہوئی چیزوں کی فروخت میں کاریگری کی وجہ سے قیمت بڑھانے میں کوئی حرج نہیں پایا۔

اس حقیقت کو حضورؐ نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا اور اس شخص کو جس نے دست بدست معاملہ میں دو صاع کی فروخت ایک صاع سے کی فرمایا۔ اوہ عین الربا (یہ تو سراسر سُود ہے) یہاں آپ نے بدلی جانے والی چیز کی کمی بیشی کی بنا پر اس لین دین کو عین سودی قرار دیا، خواہ اس میں ایک صاع کی عمدگی اور دو صاع کے گھٹیا ہونے کی وجہ سے کسی فریق پر کوئی ظلم نہ ہوا ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے ربوٰا کو حرام قرار دیا تو ہر اس چیز کو بھی حرام ٹھہرایا جو اس کے مشابہ تھی، خواہ وہ صورت ہی میں مشابہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے اس صورت کو باطل قرار دیا۔

اس کی دوسری مثال حرام چیزوں مثلاً شراب کی خرید و فروخت کی ممانعت ہے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اس حکم میں بھی سد ذریعہ کی حکمت پوشیدہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب کسی مسلمان نے شراب کی تجارت کی تو آپ نے فرمایا "فلاں شخص کو خدا ہلاک کرے۔ کیا اسے معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہود پر چربی حرام کی گئی تھی مگر وہ اس کی تجارت کر کے اس کی قیمت کھانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی"۔ اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ یہود پر چربی کی بعض قسمیں ان کی سرکشی کی بدولت حرام کی گئی تھیں تاکہ انہیں انتباہ ہو اور وہ عاجزی اختیار کریں۔ چربی کی تجارت کر کے اور اس سے نفع حاصل کر کے یہود نے اللہ تعالیٰ کی حکمت باطل کر دی۔ اسی کا نتیجہ خدا کی لعنت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شراب کی تجارت بھی اسی علت کی بنا پر ممنوع قرار دی گئی تاکہ شراب نوشی کے دروازے بند کئے جائیں اور اس سے نفرت بڑھائی جائے۔ حکم کی اس حکمت کے باوجود اگر کوئی مسلمان یہ تجارت کرے تو اس کا یہ کام یہود کے اس کام سے ملتا جلتا ہوگا جس کے سبب سے ان کے رب کا ان پر غضب ہوا۔

اصول تشریع اصول تشریع مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا۔ حدود و تعزیرات کی جرم کی مقدار سے مناسبت:

شریعت الٰہیہ میں کسی جرم کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ کہیں کہیں اہل دنیا کے احساس جرم سے بالکل مختلف ہے۔ ہم نے مختلف قوموں کے ہاں یہ مشاہدہ کیا ہے کہ ان کے احساس جرم کے لحاظ سے ان کی تعزیرات میں بڑا اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر بعض علاقوں کے لوگ زانی اور زانیہ کو قتل کر دیتے ہیں اور غیرت کی وجہ سے قتل میں پہل ان کے باپ کی طرف سے ہوتی ہے، اس کے برعکس بعض علاقوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بیوی یا لڑکی کی بے حیائی پر اغماض برتتے ہیں بلکہ قوم کے سرداروں کے پاس انہیں بھیج دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں کے ہاں زنا کی سزا میں بڑا فرق ہوگا۔ یہی حال چوری اور دوسرے جرائم کا ہے۔ شریعت نے کسی جرم کو جو اہمیت دی ہے اسی کے اعتبار سے ٹھیک اس جرم کے مطابق اس کی تعزیر رکھ دی ہے۔

ب۔ احکام شریعت میں تدریج ہے:

ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت کے مشکل احکام یک بیک نہیں دے دیئے گئے بلکہ ابتداً آسان

احکام دیئے گئے اور جب طبیعتیں ان کو برداشت کرنے لگیں تو نسبتاً مشکل احکام نازل ہوئے۔ شریعت کی یہ تدریج دراصل لوگوں کی استعداد کے مطابق تھی۔ اور یہ اسی طرح کی تدریج تھی جس طرح کی تدریج ہماری خلقت میں، علوم وصنائع کی ترقی میں اور تعمیر اخلاق میں پائی جاتی ہے۔ یہ تدریج ہی تھی جس کی بنا پر ان احکام میں نسخ ضروری ہوا جو ابتداء میں محض تربیت کے لئے نازل ہوئے تھے۔

ج۔ ہر مشروع حکم کی ایک صورت اور ایک حقیقت ہے:

اگر کسی حکم کی ایک خاص صورت متعین کر دی جائے تو اس سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ اس کو نافذ کرنا ممکن ہوتا ہے۔

۲۔ لوگوں کے لئے اس پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے،

۳۔ اس حکم میں تمام لوگ مساوی ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کی حیثیت ایک شعار کی ہوتی ہے جس سے لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے اور بر و تقویٰ میں تعاون کرتے ہیں،

۴۔ اس حکم کے نتیجہ میں ظاہر باطن کا مددگار اور اس کی تربیت کا ایک وسیلہ بنتا ہے، اور

۵۔ آدمی کو ایک ایسی علامت اور طراز مل جاتی ہے جس سے وہ اپنے نفس کا حال جان سکتا ہے اور دین داری اور عبودیت میں اپنا مقام متعین کر سکتا ہے۔

جہاں تک احکام شریعت کے پر از حکمت ہونے کا تعلق ہے یہ ایک واضح حقیقت ہے جس کی تصریح قرآن نے بے شمار موقعوں پر کی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں جو عمل بھی مشروع ٹھہرایا گیا ہے اس کا حقیقی مقصد واضح کر دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر قرآن نے اس حکم کے انجام اور دین کی عمارت میں اس کی حیثیت اور نقطہ اتصال کی وضاحت بھی کر دی ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات کو دیکھئے۔

۱۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا

خدا کو نہ ان (قربانیوں) کا گوشت پہنچے گا اور نہ ان کا خون۔ بلکہ اسے تمہارا صرف تقویٰ پہنچے گا۔ اسی طرح اس نے تمہارے لئے ان کو مسخر کر

اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (حج ۲۷)

دیا تاکہ اللہ نے تم کو جو ہدایت بخشی اس پر اس کی بڑائی بیان کرو۔ اور (اے نبی) نیکوکاروں کو بشارت دے دو۔

۲- مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (مائدہ ۶)

اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اُوپر تنگی پیدا کرے بلکہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تمہارے اُوپر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم شکر گزار بنو۔

۳- کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (بقرہ ۱۸۳)

تمہارے اُوپر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

۴- وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۱۷۹)

اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو، تاکہ تم بچو۔

۵- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ ۱۴)

اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

۶- وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (حج ۳۲)

اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ فعل دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔

۷- جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّھْرَ الْحَرَامَ وَ الْھَدْیَ وَ الْقَلَآئِدَ ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ (مائدہ ۹۷)

اللہ نے مشروع ٹھہرایا ہے کعبہ بیت الحرام کو جو لوگوں کے لئے موجب امن ہے، اور عزت کے مہینوں اور قربانی کے جانوروں اور پٹے والے جانوروں کو۔ یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ سب کو جانتا ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ان آیات میں ہر حکم کے ساتھ اس کی غایت بھی واضح کر دی گئی ہے۔

۵- شریعت نے جزوی مسائل کو استنباط کے لئے چھوڑ دیا ہے:

شریعت نے صرف کلیات کے بیان پر اکتفا کیا ہے اور جزوی مسائل کو مسلمانوں کے استنباط کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس میں دو حکمتیں ہیں۔ پہلی حکمت یہ ہے کہ تعلیم اخلاق اور تربیت کیلئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور کوئی محدود مدت ہر جزوی حکم کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے اہم اور بڑے احکام پہلے دیئے جاتے ہیں اور یہی احکام نشوونما پاکر درجہ کمال کو پہنچتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمائے گئے اور قرآن تمام بنی نوع انسان کی طرف اتارا گیا۔ خدا نے صحابہ کرامؓ کو شہداء علی الناس قرار دیا اور وہ اس ذمہ داری کو تابعین اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے لوگوں کے واسطے سے ادا کر سکے۔ اسی لئے یہ ضروری ہوا کہ شریعت کے بنیادی احکام میں تمام تفاصیل پوشیدہ ہوں اور ان کی طرف رہنمائی دے دی جائے۔ ہمارے مجتہدین اس حکمت کو سمجھتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی لئے قرآن کے اجمال کی وضاحت کی کیونکہ تمام لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ از خود مسائل کا استنباط کریں اور صحیح رائے قائم کر سکیں۔ اس طرح گویا حضورؐ نے مجتہدین کے لئے اجتہاد کی ایک سنت چھوڑی اور یہ نص قرآن سے بھی ثابت ہے۔

اسی طرح پچھلی شریعتیں اپنے اندر کمال تک پہنچنے کی صلاحیت رکھنے والی تھیں اور اسلام کے ذریعہ سے ان کی اسی صلاحیت احیاء ہوا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ شرائع کو باطل نہیں کیا بلکہ ان کی تصدیق اور تکمیل کی۔ کمال کی طرف یہ رہنمائی ہی دراصل شریعت کی تکمیل ہے۔ لہٰذا اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے ہر جزئی مسئلہ کی تفصیل قرآن میں پیش کر دی ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ کمال تک رہنمائی کے لئے جو کچھ مطلوب ہے سب اس شریعت کے اندر ودیعت ہے۔

احکام شریعت کو جزئیات تک نہ پھیلانے کی دوسری حکمت یہ ہے کہ اس طرح عقل کی تربیت ہو، اور فکر و تدبر کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت کے درمیان ایک حد تک وسعت رکھ دی ہے جس میں ہم اپنی عقل و رائے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس نے اعمال میں بھی ایک گنجائش رکھی ہے تاکہ یہ لوگوں کے لئے سرگرمی اور مسابقت کا باعث بنے مثلاً روزے کے حکم کے ضمن میں فرمایا کہ جو شخص اپنی خوشی سے

زائد کوئی نیکی کرے گا تو وہ اس کیلئے بہتر ہوگی۔ اس وسعت و گنجائش کی ظاہر حکمت یہ ہے کہ شریعت بھی فطرت کے دوسرے اسباب کی طرح اپنے اندر تربیت و نشوونما کے محرکات رکھتی ہے۔ اس سے انسان کی ان پوشیدہ قوتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کیلئے وہ قوتیں استعمال کی جائیں جو حاصل ہیں اور ان ذرائع سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے جو خالق نے اس کے لئے پیدا کر دیئے ہیں۔ شریعت کی مثال ایک راستہ کی ہے، منزل کی نہیں۔ اس کا کمال اس پر قائم رہنے میں ہے۔ ایک راستہ چلنے والا نہ تو راستہ چھوڑتا ہے اور نہ اندھا یا سراسیمہ ہو کر کہیں رکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کو "نور" (روشنی) اور "حیاۃ" (زندگی) کا نام بھی دیا ہے، پھر یہ جمود اور تقلید سے کیسے مناسبت رکھ سکتی ہے؟ عمومی اور صحیح کلیات سے چونکہ حقائق اور مصلحتیں برابر حاصل ہوتی رہتی ہیں اس لئے شریعت اُمت کو بلند کرتی اور روز بروز اس کو ترقی دیتی رہتی ہے۔

یہود و نصاریٰ کی شریعتوں سے ہم نے جانا ہے کہ اول الذکر کی سختی اور ثانی الذکر کی نرمی نے دونوں اُمتوں کے مزاج پر دو مختلف قسم کے اثرات ڈالے۔ اسلامی شریعت ان دونوں کے بین بین ہے۔ قرآن نے ایک تو احکام کی جزئیات بیان نہ کیں تاکہ لوگ انہیں خود اس سے مستنبط کریں۔ دوسرے اس نے وہ تفاصیل نظر انداز کر دیں جو پہلی مذہبی کتابوں کے ذریعہ سے شہرت پا چکی تھیں اور اس حد تک تواتر کو پہنچ گئی تھیں کہ ان کو تبدیل کرنا یا ان میں تحریف کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے لئے دو چیزیں شریعت کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ایک تو وہ چیزیں جو مرکز اور قطب کی طرح ہیں جن کے جاننے کے لئے ہمیں عقل کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور اگر عقل استعمال کی بھی جائے تو وہ محض بصیرت حاصل کرنے اور علم میں اضافہ کرنے کی خاطر ہوگی۔

دوسرے وہ چیزیں جو فروع سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کو قرآن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت شدہ حالات، تحقیق کردہ علوم صحابہؓ اور سلف صالحین میں جلیل القدر تابعین کی رائے سے مستنبط کرنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ڈالی گئی۔ جمہور اُمت نے اس معاملہ کو اسی طرح سمجھا۔ انہوں نے عقل کو استعمال کیا، مسائل مستنبط کئے، انہیں فروع کا نام دیا اور عام لوگوں نے مجتہدین کی اس میں تقلید کی۔ استنباط مسائل میں مجتہدین کے درمیان اختلاف بھی واقع ہوا مگر اس میں انہوں نے کوئی حرج نہیں سمجھا اور فروع میں[ص]

ص اپنے اختلافات کے باوجود وہ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے رہے۔

مراسلہ و مذاکرہ

جناب مولانا عبدالباری صاحب مدظلہ

حلقہ تدبرِ قرآن سے متعلق

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ کا مکتوب گرامی

برادر اعز و اکرم زادکم اللہ کرامۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واپسی سے پہلے ایک اور اطمینان و تفصیل کی ملاقات و حاضری سے محرومی کا بڑا افسوس رہا۔ بڑا سبب فاصلوں کی دوری اور "عذر لنگ" کی بدولت قدم قدم پر سواری کی محتاجی رہی۔

تازہ "میثاق" میں یہ پڑھ کر کچھ نہ پوچھئے کتنی مسرت ہوئی کہ "حلقہ تدبر قرآن" کے لئے مکان ہی نہیں "موزوں و مناسب مکان" کا اللہ تعالیٰ نے سامان فرما دیا۔ بارک اللہ فی برکاتکم۔

اسلام اور پورے عالم اسلام کے حق میں وقت کا سب سے بڑا فتنہ نئی تعلیم و تہذیب کے خود ہمارے نام کے مسلمان بھائی بن رہے ہیں۔ سیاست و قیادت پر ان کے ہمہ گیر قبضے نے سب کو ان کے مقابلے میں بے بس بنا رکھا ہے۔ پھر نہ اس تعلیم و تہذیب کی دن دونی رات چوگنی ترقی و تعدیہ کو روکا جا سکتا ہے اور نہ اس کے ہاتھوں سے حکومت و اقتدار کو چھینا جا سکتا ہے۔

حل ایک اور صرف ایک ہے کہ خود اس تعلیم کے دوران ہی میں ان کے حال و مآل کی اصلاح ہو۔ صورت بھی اس کی عملی اور نسبتاً آسان ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ جہاں جہاں ڈگری کالج ہوں وہاں ایسے اسلامی ہاسٹل قائم کئے جائیں جو دوسرے ہاسٹلوں اور نجی قیام گاہوں کی کم و بیش سہولتوں کے ساتھ ممکن حد تک کم خرچ ہوں۔ ڈگری کالجوں کی تخصیص اس لئے کہ اجمال سے

بھی زیادہ ایمانیات کا بگاڑ گریجویٹ بنانے والے دو تین سالوں ہی میں زیادہ ہوتا ہے۔ خدا کی ذات وصفات، نبوت و آخرت وغیرہ کم و بیش سارے ہی عقائد کی چولیں ہل جاتی ہیں الا ماشاء اللہ۔ یہ خود اپنے قریباً اٹھائیس سالہ اور دو دو یونیورسٹیوں کی معلمانہ خدمات کے تجربات ہیں۔

سب سے کٹھن مسئلہ ایسے ہاسٹلوں کے لئے ذمہ دار نگرانوں اور مربیوں کے وہی آپ کی تشخیص کے مطابق "قحط الرجال" کا ہے لیکن جیسا آپ سے گفتگو نیز آپ کی تحریروں اور تجربوں سے اندازہ ہوا آپ کا حلقہ "تدبر قرآن" ہی انشاء اللہ ایسے رجال بھی فراہم کرتا رہے گا بلکہ آپ کی زیر نگرانی مرکزی حلقہ خصوصیت کے ساتھ ایسے رجال ہی کی تیاری کا ادارہ ہونا چاہئے جو زندگی کا خصوصی مشن ایسے ہاسٹلوں کا قائم کرنا ہی بنالیں۔ یہ آپ کی بڑی تعمیری کرامت ہی کرامت ہوگی۔

حالات کے دیکھتے بس یہی ایک بند ہے جو مستقبل میں اس طوفانی فتنے کے مستقل روک کے سلسلے میں باندھا جا سکتا ہے جس تیزی سے عوام و خواص سب کو یہ طوفان اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے اگر اسی تیزی سے اس کو روکنے کی اب بھی جد و جہد نہ کی گئی تو اعاذنا اللہ اس کی ایمانی و عملی و بائی ہلاکت خیزیوں سے تحفظ بھی آخری اور شاید بس ایک دو نسل ہی کی مہلت معلوم ہوتی ہے۔

کیا عرض کیا جائے یہ سراپا بے علم و عمل جب ماشاء اللہ اچھے اچھے اہل صلاح و اصلاح کی خدمت میں یہ صورت حال عرض کرتا ہے تو اس کا احساس صد فی صد اتفاق کے ساتھ سبھی میں معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنی توجہ و توانائی اس کے لئے اتنی بھی صرف فرمانے پر آمادہ نہیں ہوتے جتنی وقتی و مقامی مسائل کے لئے کسی اخبار کے نکالنے میں فرماتے ہیں۔

آپ البتہ اس نابکار کے ابتدائی معروضات ہی کے بعد بذات خود عملاً بھی آمادہ ہو گئے تھے اور اب مکان مل جانے کے بعد اگر یکسوئی کے ساتھ آپ ہی نے اس کو بطور ایک مستقل تحریک کے چلانے کا عزم فرما لیا تو خدا نے چاہا مختلف مقامات پر دو چار ہاسٹلوں کے چل جانے اور ان کی اہمیت و افادیت کا عملی مشاہدہ ہو جانے سے خود ہی چل پڑے گی جس کے بعد آپ کے مرکز کا اصلی کام اس کے لئے رجال تیار کرتے رہنا ہوگا۔ جن کی ہر طرف سے مانگ ہوتے

لگے گی۔

جب سے مکان ملجانے کی خوشخبری ملی ہے، بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ اُڑ کر پہنچ جاؤں اور کم از کم ایک جگہ اپنی ناکارہ زندگی میں عملاً اس کو چلتا دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کر لوں، اور جو کچھ اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سالہا سال سے سوچتا رہا ہوں وہ تفصیل سے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اُمید ہے کہ کچھ نہ کچھ باتیں کام کی اور قبول کے لائق ہونگی۔

اس مرتبہ کا طویل سفر تو بڑھاپے اور صحت کی غیر یقینی حالت کو دیکھتے ہر طرح بحمداللہ صحت و خیریت ہی کے ساتھ پورا ہوگیا۔ البتہ واپسی کے بعد اچانک بلڈ پریشر اتنا زیادہ گر گیا جتنا کبھی نہ گرا تھا۔ اب قریباً بحال ہوگیا ہے۔ لیکن طبیعت ابھی بحال نہیں۔ کمزوری زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ عریضہ بھی پلنگ سوار نیم دراز لکھا رہا ہوں۔ صحت کے ساتھ سلامتی ایمان اور مغفرت کی دُعا کا خصوصاً بہت عاجزانہ ملتجی ہوں والسّلام مع الاکرام۔

احقر العباد: عبدالباری

میثاق:۔ حلقۂ تدبر قرآن کے سلسلہ میں، بزرگوں میں سے سب سے پہلے مولانا ہی نے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی ہے ان کا مکتوب گرامی محض اس خیال سے ہم نے ان صفحات میں شائع کر دیا ہے کہ ایک ایسے بزرگ عالم دین کی رائے اس کام کی اہمیت سے متعلق لوگوں کے سامنے آجائے جن کی ساری زندگی یونیورسٹیوں کے ماحول کا تجربہ کرنے اور جدید تعلیم کے اثرات و نتائج کا اندازہ کرنے میں گذری ہے۔ ہمیں مولانا کی ہمت افزائی سے بڑا اطمینان ہوا ہے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ان تمام قیمتی مشوروں سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے جن کی انہوں نے اُمید دلائی ہے۔ نیز ہمیں یہ توقع ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں بھی ہمیں یاد رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کی نعمت سے نوازے اور اپنے دین کی یہ خدمت انجام دینے کی توفیق دے اور اس کے لئے اسباب و وسائل فراہم کر دے۔

یہ واقعہ ہے کہ اب تک جن حضرات کے سامنے بھی اس اسکیم کا ذکر آیا ہے اُنہوں نے (جیسا کہ مولانا نے بھی اپنے مکتوب گرامی میں اشارہ فرمایا ہے) اس کی ضرورت و افادیت کا پورا

پورا اعتراف کیا ہے لیکن عملی تعاون کا معاملہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس زمانے میں ہنگامی اور وقتی چیزوں کا ذوق طبیعتوں پر اس قدر غالب ہے کہ لوگ مفید سے مفید کام کو بھی جس کی افادیت خود ان پر بھی واضح ہو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دیتے جب تک اس کے اندر کوئی ہنگامی نوعیت کی کشش نہ ہو۔ جو لوگ اس قسم کی کوئی خدمت انجام دینا چاہیں انہیں زمانہ کی اس بذاقی کو سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔ لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اب بھی اگر کوئی شخص عزم کے ساتھ کام کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو تو اللہ کے بندے تعاون کے لئے مل ہی جاتے ہیں۔ پچھلے میثاق میں ہم نے جو اپیل کی تھی وہ ابھی ہمارے تمام دوستوں کو تو متوجہ نہیں کر سکی ہے لیکن راہگاں بھی نہیں گئی۔ کچھ نہ کچھ قدم آگے ہی بڑھا ہے۔ بعض احباب نے بڑے حوصلہ سے اس میں شرکت کی ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے دوسرے مخلصین بھی اس میں تعاون کریں گے۔

اب ہم نے حلقہ تدبر قرآن کے دوسرے بیچ کے لئے طلبا کا انتخاب شروع کر دیا ہے اور پہلے بیچ کا کام پوری سرگرمی سے جاری ہے۔ پہلے بیچ کے طلبہ الحمد للہ اب کلیدِ دمنہ اور مسلم شریف کی عبارتیں پوری روانی سے پڑھنے اور ان کے ترجمے کرنے لگے ہیں حالانکہ خاص اس کام کو شروع ہوئے چھ سات ماہ سے زیادہ نہیں گزرے اور وقت بھی اس پر اوسطاً روزانہ گھنٹہ پون گھنٹہ سے زیادہ صرف نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں بھی اس وقت سورۂ انعام زیرِ درس ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے لوگوں کو تفسیر و حدیث، فقہ اور عربی ادب کی کتابیں مطالعہ کرتے اور مسلم شریف کی قرأت کرتے ہوئے دیکھ کر دل بے اختیار خدا کے شکر میں ڈوب جاتا ہے کہ اس نے اپنے دین کی خدمت کی ایک راہ سجھائی۔ یہ صرف اس کا فضل و احسان ہے۔ بعض کاموں کی ابتدا بڑی چھوٹی ہوتی ہے لیکن ان کے نتائج بڑے اہم اور شاندار ہوتے ہیں۔ یہ کام بھی انشاء اللہ انہی کاموں میں سے ہے۔ اس دور میں دین کی حقیقی خدمت کے لئے جس طرح کے علماء کی ضرورت ہے وہ اسی طریقہ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ کاش لوگ اس کی حقیقی اہمیت کو سمجھ سکیں۔

آخر میں ہم مولانا مدظلہ کی صحت کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ اور اپنے لئے ان سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔

مقالات

جناب خالد مسعود صاحب

حفاظتِ قرآن

اهل مذاہب کے مذہبی صحیفوں میں قرآن اپنے اس دعویٰ میں منفرد ہے کہ وہ محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار خود اس کا نازل کرنے والا ہے۔ لہٰذا جب تک دنیا قائم ہے اس کی یہ حیثیت باقی رہے گی۔ سورہ حجر میں حفاظت کے اس وعدہ کا بیان اس طرح ہوا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ع۔۹) "بیشک ہم ہی نے اس ذکر کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ ہندوؤں کی گیتا ہو یا یہود کا پرانا عہد نامہ (OLD TESTAMENT)، عیسائیوں کی انجیل ہو یا کوئی بھی دوسری مذہبی کتاب کسی نے اپنے محفوظ ہونے یا اپنی اصلیت کے شبہ سے بالاتر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

مذہبی صحیفوں کے بجائے اگر اقوام و ملل کا جائزہ لیا جائے تو کرۂ ارض پر صرف ایک قوم ایسی ملتی ہے جو اپنی مذہبی کتاب کو شک و شبہ سے بالاتر سمجھتی ہے اور یہ مسلمان قوم ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اس کی رہنما کتاب حفاظت کے تمام لوازمات کے ساتھ آسمان سے اتری اور جب امت کی تحویل میں دی گئی تو اس نے اس کی حفاظت کے لئے اپنے خونِ جگر کو تحلیل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم اپنی مذہبی کتاب کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ زبانیں ہی دنیا سے معدوم ہو چکیں جن میں یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ دوسرے یہ قومیں اپنے ہاتھوں ان کتابوں کے نت نئے ایڈیشن شائع کرتی رہتی ہیں اور ہر شخص بآسانی دو ایڈیشنوں کا باہمی فرق ملاحظہ کرسکتا ہے۔

قرآن اور مسلمانوں کے ان دعاوی کو جان کر قدرتی طور پر ذہن میں چند سوالات ابھرتے ہیں مثلاً یہ کہ قرآن کی حفاظت کا مفہوم کیا ہے؟ اس کو اپنے محفوظ ہونے پر اصرار کیوں ہے؟ وہ کیا ضرورت تھی جس کی بنا پر خدا نے باقی کتابوں کو محفوظ رکھنے کا ذمہ نہیں لیا اور یہ اعزاز صرف قرآن کو بخشا؟ حفاظت کا یا اہتمام کن طریقوں سے کیا گیا؟ کیا موجودہ قرآن بعینہٖ وہی ہے جو فی الحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا؟ وغیرہ ہم ان سوالوں پر مختلف پہلوؤں سے غور کریں گے۔

حفاظت قرآن کا مفہوم حفاظت قرآن کے مفہوم کو قرآن کی جو آیت غالباً سب سے بہتر طریقہ پر واضح کرتی ہے وہ یہ ہے:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝

اور یہ ایک کتاب عزیز ہے۔ باطل نہ اس میں اس کے آگے سے آسکتا نہ اس کے پیچھے سے یہ حکمت والے اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

(حم سجدہ - ۴۱ - ۴۲)

اس میں قرآن کی پہلی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ یہ حکیم وحمید خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ کی روایت کی نہیں ہے۔ یہ اوّل تا آخر انہی الفاظ و فقرات پر مشتمل ہے جو خدا نے انسانوں کی تعلیم کے لئے پسند فرمائے۔ یہ یاد رہنا چاہیئے کہ سابق آسمانی کتابوں کی حیثیت یہ نہیں۔ مثال کے طور پر بائیبل کی جن کتابوں کو حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں بیشتر بنی اسرائیل کی وہ تاریخ بیان ہوئی ہے جو حضرت موسیٰؑ ہی کے زمانۂ نبوت سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں کہیں احکام کا ذکر آیا ہے وہاں بھی اکثر حضرت موسیٰؑ یہ اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ "اے بنی اسرائیل، خداوند تمہارا خدا یوں فرماتا ہے ....." جہاں تک انجیل کا تعلق ہے، یہ اگرچہ بڑی پر از حکمت ہے لیکن اوّل تا آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے کلام پر مشتمل ہے۔ یہی حال زبور کا اور ان صحیفوں کا ہے جو مختلف انبیاء کے ناموں سے بائیبل میں جمع ہیں۔

قرآن کی دوسری خصوصیت جو اس آیت سے واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ ایک "کتاب عزیز" ہے یعنی ایسی کتاب جس پر کوئی طاقت غلبہ نہیں پا سکتی، جو شیاطین اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے باہر ہے اور اگر کوئی قوت اس کی قلبِ ماہیت کی کوشش کرے گی تو اس کے لئے یہ کتاب تر نوالہ

ثابت نہ ہوگی۔

قرآن کی تیسری خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ باطل کسی بھی جانب سے اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن خدائے برحق کا برحق کلام ہے۔ اس حق کے ساتھ کسی غیر الٰہی باطل کلام کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (یہ حکیم وحمید کی نازل کردہ ہے) کے الفاظ آجانے کے بعد لفظ "باطل" کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے یعنی ہر وہ چیز جو خدا کا کلام اور اس کی وحی نہیں اس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ کوئی مضبوط اور سچی بات، حقیقت افروز ضرب المثل یا کسی خدا رسیدہ بزرگ کے ارشادات ہی کیوں نہ ہوں۔

لفظ "باطل" کے اس طرح کے استعمال کی نظیر سورۂ حج میں ملتی ہے۔ فرمایا

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (حج ۶۲)

یہ اس لئے کہ خدا ہی حق ہے اور اس کے سوا جس کو وہ پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔

یہاں بلا امتیاز تمام شرکاء کو باطل قرار دیا گیا حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرکین عرب کے شرکاء میں خدا کے مقرب فرشتے اور انبیاء وصالحین سبھی شامل تھے۔ ان شرکاء کو باطل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی شخصیت کا حق پسند اور پاک طینت ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ الوہیت میں شریک ہو۔

اُوپر کی تفصیل سے حفاظت قرآن کا مفہوم یہ واضح ہوا کہ قرآن مجید خدا کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ انہی الفاظ پر مشتمل ہے جو خدا نے انسانوں کی تعلیم کے لئے اتارے یہ ہر قسم کے حک واضافہ سے مبرا اور تحریف سے پاک ہے اور قیامت تک نہ اس میں ایک نقطہ کا اضافہ ہو سکتا اور نہ ایک شوشہ کی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

حفاظت قرآن کی ضرورت حفاظت قرآن کے اہتمام کی ضرورت قرآن نے یہ بتائی ہے کہ پچھلی اُمتوں کو دین کی جو تعلیم دی گئی تھی اس میں بحیثیت مجموعی انسان کو مخاطب کرنے کے بجائے بعض خاندانوں یا طبقات کو مخاطب کیا گیا تھا اور دعوت میں بھی ان کے مخصوص احوال وخصوصیات کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس طرح پچھلی اُمتوں کی کتابیں صرف وقتی اہمیت کی حامل تھیں اور اپنی کیفیت

ہی کے اعتبار سے ایک جامع و کامل کتابِ ہدایت کے انتظار کا سبق دے رہی تھیں۔ قرآن نازل ہوا تو اس نے سابقہ کتابوں کی کمی کو پورا کیا۔ اس نے بحیثیت مجموعی انسان کو مخاطب کیا اور اسی کی ضروریات کو مدنظر رکھا۔ دین کی جس عمارت کی تعمیر میں تمام انبیاء نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا تھا قرآن نے اس کی تکمیل کر دی۔ جس کے بعد انسان کسی دوسرے سرچشمۂ ہدایت سے مستغنی ہو گیا۔ دین کی تکمیل کے بعد چونکہ کسی کتاب ہدایت کا نازل ہونا غیر ضروری ہو گیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو محفوظ رکھنے کا خود ذمہ لیا تاکہ اس کی طرف سے انسان کی ہدایت کا وعدہ پورا ہو سکے اور قرآن کے غیر محفوظ ہونے کی صورت میں روحانی دنیا میں اندھیرا نہ چھا جائے۔

قرآن کے اس بیان کی تائید سابقہ آسمانی کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے اندر مزید شریعت کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں ہے تو اس پر انہوں نے آنے والے نبی کی ان الفاظ میں بشارت دی:

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہو گا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔" (استثناء ۱۸: ۱۵-۲۰)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کی قوت برداشت کو ضعیف پایا اور تکمیل دین کا کام اپنے بعد آنے والے نبی کے لئے چھوڑ دیا۔ آپ چونکہ بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے اس لئے آپ کی بشارت کا مصداق سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک موقع پر آپ نے ایک تمثیل بیان فرمائی جس میں انبیاء کے بارے میں بنی اسرائیل کا طرز عمل بتایا، پھر یہ خبر دی کہ یہ قوم خود ان کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔ اس کے بعد مستقبل کے بارے میں بتایا

کہ خدا کی بادشاہی کن کو ملنے والی ہے؟ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے تاکستان لگایا اور اس کی چاروں طرف احاطہ گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا اور اسے باغبانوں کو ٹھیکے پر دے کر پردیس چلا گیا۔ اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس اپنا پھل لینے کو بھیجا۔ اور باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا تو لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا یہی وارث ہے، آؤ اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں اور اسے پکڑ کر تاکستان سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب تاکستان کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا؟ انہوں نے اس سے کہا۔ ان بدکاروں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور تاکستان کا ٹھیکہ دوسرے باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے"۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا"۔

(متی ۲۱ = ۳۳-۴۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو آخری وصیت کرتے ہوئے جو الفاظ کہے وہ بھی قابلِ غور ہیں۔ آپ نے فرمایا،

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دُنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے

گا۔ ..... مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا ۱۶ = ۷، ۸، ۱۲، ۱۳)

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام دونوں نے کامل دین کی علمبرداری کے لئے بنی اسرائیل کی عدم صلاحیت کا اظہار فرمایا اور اس تکمیل کے لئے ایک نئے نبی کی آمد کا انتظار کرنے کا حکم دیا جس کی حیثیت کونے کے سرے کے آخری پتھر کی تھی۔ اس نبی کی نمایاں علامت جو دونوں حضرات نے بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ "خدا اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا" اور "وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا" یہ ٹھیک ٹھیک قرآن مجید کی اسی خصوصیت کا بیان ہے، جس کا حوالہ ہم اوپر تنزیل من حکیم حمید کے تحت دے چکے ہیں۔

حفاظت قرآن کے انتظامات

یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے لیکن اس کی مخاطب وہ مخلوق ہے جس کی خلقت مٹی سے ہوئی ہے اور جس کی سائی محسوس چیزوں ہی تک ہو سکتی ہے۔ یہ بات اس کے بس کی نہیں کہ وہ براہ راست خدا سے ہدایت حاصل کر سکے۔ انسان کی یہی درماندگی اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے نزول کے لئے کچھ واسطوں سے کام لے جو اس قدر مستحکم ہوں کہ قرآن کو ٹھیک اس کی اصلی شکل میں انسانوں کو پہنچائیں۔

فرشتہ کا انتخاب قرآن مجید سے اور پہلی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے ہر زمانہ میں فرشتوں کو پہلا واسطہ بنایا ہے۔ فرشتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی خلقت نورانی ہے۔ اس بنا پر وہ ذات خداوندی کے انوار و تجلیات کے تحمل کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جو پیغام دیتا ہے وہ اس کو لے کر زمین پر اترتے ہیں اور خدا کی امانت انسانوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ فرشتوں اور انسانوں میں قدر مشترک ان کا مخلوق ہونا ہے اس لئے انسان ان سے ربط و ارتباط کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن کا بیان ہے کہ کلام خداوندی کے نزول پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں سے بزرگ ترین فرشتہ جبریلؑ کو مامور کیا۔ یہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مقرب اور قدر و منزلت رکھنے والا ہے۔ اس کی سرداری کے پیش نظر دوسرے تمام فرشتے اس کے مطیع ہیں اور خدا کی طرف سے لائے ہوئے ہر حکم کی تعمیل پر فوراً کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ فرشتہ بڑا امانت دار ہے اور بارگاہ ایزدی میں اسے وہ فرائض سونپے جاتے ہیں جو سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اپنی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں یہ فرشتہ کوئی کوتاہی نہیں کرتا اور اس کو اتنی قوت حاصل ہے کہ یہ خدا کے ہر فرمان کو ٹھیک اس کے منشا کے مطابق پورا کرتا ہے اور کوئی طاقت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہونے پاتی۔ جبریل علیہ السلام کی ان خصوصیات کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا گیا ہے

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (تکویر ۲۱)	بیشک یہ اس فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے جو صاحب قوت، مالکِ عرش کے ہاں اونچے درجے والا، سردار اور امانت دار ہے

قرآن و حدیث میں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریلؑ کے علاوہ بھی کوئی فرشتہ قرآن لے کر اترا ہو۔ اس کے برعکس قرآن سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ ذمہ داری صرف جبریل علیہ السلام نے ادا کی۔ مثلاً فرمایا

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (بقرہ ۹۷)	کہو کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہے وہ جان لے کہ اسی نے اس کو (قرآن کو) تیرے دل پر اتارا۔

دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ (الشعراء ۱۹۳)	اور یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ (جبریل) تیرے قلب پر لے کر اترا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ایک جامع کمالات و آزمودہ کار فرشتہ کے ذریعہ سے ہوا۔ اس کے مشن میں خدا کے حکم سے دوسرے فرشتوں نے پورا تعاون کیا اور اس کے احکام کی تعمیل میں کوئی سرتابی نہیں کی۔

نزول قرآن کے لئے جبریلؑ ایسے فرشتہ کے تقرر کے بعد حفاظت قرآن کا کوئی دوسرا اقدام نہ بھی کیا جاتا جب بھی یہ مقصد بدرجہ اتم پورا ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہوا کہ نزول قرآن کے زمانہ میں منفی طاقتوں کی تگ و دو پر بھی قدغن لگا دی جائے۔

منفی طاقتوں کا سدباب اس عالم کون و مکاں میں خدا کی جو مخلوق آباد ہے اس میں بعض عناصر ایسے بھی ہیں جن کو خدا نے خیر و شر دونوں کو اختیار کرنے کی ایک حد تک آزادی دے رکھی ہے اس آزادئ اختیار و عمل کی بدولت ان کے شر پسند افراد حق کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں اور حتی الامکان اس کی راہ میں مزاحم ہونے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ ایسے عناصر میں شیاطین شامل ہیں جو جن و انس دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیاطین جن اپنے انسانی ہم مشربوں پر یہ فوقیت رکھتے ہیں کہ ان کی رسائی ان مقامات تک ہے جہاں تک انسان کی رسائی نہیں ہے اس لئے وہ فرشتوں کے عزائم اور مصروفیات کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نزول قرآن کے زمانہ میں اگر ان شیاطین کی تگ و دو کو محدود نہ کیا جاتا تو یہ قرآن کی مخالفت کی اپنی سی کوشش کرتے اگرچہ جبریل علیہ السلام کے مقابل میں ان کی کسی کوشش کا بار آور ہونا ناممکن تھا تاہم اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو جبریلؑ کا مزاحم ہونے کا موقع ہی نہیں دیا اور عالم بالا کے رستے میں ان کی آمد و شد کو روکنے کی خاطر پہرے بٹھا دیئے تاکہ اگر کوئی شیطان مزاحمت کی کوشش کرے تو فوراً اس کی سرکوبی کر دی جائے خالق کائنات کے اس انتظام کا اقرار خود جنات کی زبان سے قرآن میں یوں کروایا گیا ہے۔

وَاِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (جن ۹)	اور یہ کہ پہلے ہم وہاں بہت سے مقامات میں خبریں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننا چاہے تو اپنے لئے انگارا تیار پائے۔

یہی حقیقت سورہ القدر میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ۔ (القدر ۲،۳)	شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور ہر کام کی روح اپنے پروردگار کے حکم سے نازل ہوتی ہے۔ یہ رات سلامتی ہے۔

یعنی قرآن مجید کے نزول کی رات دوسری تمام راتوں سے مختلف نوعیت کی تھی۔ اس رات خدا کی رحمتیں اور برکتیں فرشتوں کے جلو میں نازل ہوئیں اور ارواح خبیثہ اس رات کی حرمت کو پامال کرنے کی کوئی کوشش نہ کر سکیں۔

شیاطین کی دست اندازی کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ جبریل علیہ السلام کے کام میں مزاحم ہونے کے بجائے اس امر کی کوشش کرتے کہ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح کی باتیں القا کریں جس طرح کی باتیں جبریل علیہ السلام لائے تھے۔ لیکن یہ امکان اس لئے مستبعد قرار پاتا ہے کہ قرآن ہدایت کی وہ اعلیٰ ترین کتاب ہے جس سے بہتر اور موزون تر کسی کتاب کا وجود نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب اور اس کی ایک ایک آیت حق کو پیش کرتی اور باطل کی تردید کرتی ہے۔ اس لئے شیاطین کے مقصد سے جتنی دور یہ کتاب ہے اتنی دور کوئی دوسری کتاب نہیں ہو سکتی۔ ان کی تمام تر کوشش تو اس مقصد کے لئے صرف ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کو حق سے موڑیں، انہیں باطل پرستی کی دعوت دیں، انہیں شرک، بداخلاقی، بے حیائی اور قطع رحم کی تعلیم دیں اور اپنی تعلیمات کے نتیجہ میں انہیں سبز باغ دکھائیں۔ اگر شیاطین ان کاموں سے باز آجائیں اور لوگوں کو حق پرستی، اطاعتِ رب، صلہ رحمی اور حسن اخلاق کا درس دینے لگیں، جو قرآن کا طرۂ امتیاز ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے گھر کو خود اپنے ہی ہاتھوں آگ لگا دی۔ ایسا ہونا ہر اعتبار سے ناممکن ہے۔

اس حقیقت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی وہ تقریر واضح کرتی ہے جو انہوں نے ایک ایسے موقع پر ارشاد فرمائی جب یہود نے آپ پر یہ الزام لگایا کہ بدروحوں کا سردار بعلزبول آپ کے قبضہ میں ہے۔ آپ کے ہاتھوں سے اپاہجوں اور معذوروں کو جو شفا حاصل ہوتی ہے اور آپ کے فیض سے بدروحیں جو لوگوں کو چھوڑ جاتی ہیں تو یہ کسی معجزہ کا کرشمہ نہیں بلکہ بعلزبول ہی کی مدد کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ مرقس کی روایت میں اس تقریر کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور فقیہہ جو یروشلیم سے آئے تھے یہ کہتے تھے کہ اس کے ساتھ (یعنی حضرت عیسیٰ کے قبضہ میں) بعلزبول ہے اور یہ بھی کہ وہ بدروحوں کے سردار کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ وہ ان کو پاس بلا کر ان سے تمثیلوں میں کہنے لگا کہ شیطان کو شیطان کس

طرح نکال سکتا ہے؟ اور اگر کسی سلطنت میں پھوٹ پڑ جائے تو وہ سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور اگر کسی گھر میں پھوٹ پڑ جائے تو وہ گھر قائم نہ رہ سکے گا۔ اور اگر شیطان اپنا ہی مخالف ہو کر اپنے میں پھوٹ ڈالے تو وہ قائم نہیں رہ سکتا بلکہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن کوئی آدمی کسی زور آور کے گھر میں گھس کر اس کے اسباب کو لوٹ نہیں سکتا جب تک وہ پہلے اس زور آور کو نہ باندھ لے۔ تب اس کا گھر لوٹ لے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ بنی آدم کے سب گناہ اور جتنا کفر وہ بکتے ہیں معاف کیا جائے گا لیکن جو کوئی روح القدس کے حق میں کفر بکے وہ ابد تک معافی نہ پائے گا بلکہ ابدی گناہ کا قصوروار ہوگا۔" (مرقس ۳ = ۲۲ - ۲۹)

قرآن مجید نے اس مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ۔ (الشعراء ۲۱۱)

اور اس (قرآن) کو شیاطین لے کر نہیں اترے۔ یہ کام نہ تو ان کو سزاوار ہے اور نہ وہ اس کی طاقت ہی رکھتے ہیں۔

لہٰذا نزول قرآن کے زمانہ میں شیاطین کے تعاون کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی طرف سے ہر طرح کی مزاحمت و مخالفت کا اندیشہ ضرور متوقع ہو سکتا تھا جس کے سد باب کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام فرما دیا۔ (باقی)

ماہنامہ میثاق کی پرانی جلدیں فوراً طلب فرمائیں

○ "میثاق کے اب تک کے شائع شدہ پرچوں کے خواہشمند حضرات فوراً اپنے آرڈر ارسال فرمائیں۔

○ اس وقت پانچ چھ شماروں کے سوا تمام پرچے مہیا ہو سکتے ہیں۔ ○ اب تک کل چھتیس ۳۶ شمارے شائع ہوئے ہیں۔ قیمت فی شمارہ ساٹھ پیسے، پرانے یا نئے مستقل خریداروں سے پچاس پیسے۔

منیجر ماہنامہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور

تقریظ و تنقید

ضبطِ تولید

تالیف : قمر احمد عثمانی

شائع کردہ: مطبوعات مشرق، ہرمز جی اسٹریٹ، کراچی ۱

یہ کتاب خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں شائع کی گئی ہے۔ فاضل مصنف کا خیال ہے کہ اب تک ضبط تولید کی تائید میں جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں وہ کئی اعتبار سے تشنہ ہیں۔ ان میں بات اپنے صحیح دلائل کے ساتھ پیش نہیں کی گئی ہے اس لئے علماء نے خواہ مخواہ تحریک ضبط ولادت کی مخالفت شروع کر دی۔

اس کتاب میں مصنف نے ضبط تولید کی نئی دلیل یہ فراہم کی ہے کہ ہمارے ملک کے ذرائع معاش آبادی میں اضافہ کی رفتار کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ وسائل معاش کی یہ کمی خدا کی پیدا کردہ نہیں بلکہ ہماری اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ آبادی میں مزید اضافہ کا سدباب کر کے اتنی مہلت حاصل کریں جس میں اپنی کوتاہیوں کا مداوا کر سکیں اور ملک کے وسائل معاش کو ترقی دیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ ضبط ولادت کے حق میں یہ دلیل پیش کرنے سے علماء کے اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں اور خدا کی رزاقیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ مصنف کے نقطہ نظر پر تفصیل سے بحث کریں، لیکن ہم بنیادی طور پر ضبط تولید کے حق میں ان کی تقریر کو اس تقریر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں سمجھتے جو اب تک مصنف کے ہم مشرب افراد کی طرف سے پیش کی جاتی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرائع معاش کے متعلق یہ تصور رکھنا کہ آدمی ان پر کامل اختیار رکھتا ہے اور وسائل معاش میں تصرف بس ہمارے اشارے ہی کا منتظر ہے صرف ایک مغالطہ ہے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جو علماء کے نزدیک خدائی رزاقیت کے عقیدہ سے میل نہیں کھاتا۔ رہا کثرت آبادی کے نتیجہ میں بیروزگاری کا خطرہ تو اس کا انحصار

کثرتِ آبادی سے زیادہ ملک کے معاشی نظام پر ہے۔ مثال کے طور پر روسی نظام میں ہر فرد کو لازماً کسبِ معاش کی جدوجہد میں حصہ لینا پڑتا ہے جبکہ یورپ و امریکہ میں لاکھوں انسان بے روزگار ہیں۔ مزید برآں یورپ و امریکہ میں بے روزگاری کی کثرت کے باوجود یہ ممالک کثرتِ آبادی کے شاکی نہیں بلکہ اس کے برعکس قلتِ آبادی کا شکار ہیں۔ اس لئے ہم مصنف کے بیروزگاری کے اندیشہ کو بھی درست نہیں سمجھتے۔

اس کتاب میں مصنف نے قرآن کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے اور اخلاقیات کو بھی۔ ان بحثوں میں ان کے استدلال کی نوعیت بالکل وہی ہے جو اب تک عیسائیوں اور مرزائیوں کا طرۂ امتیاز تھی اور آج کل اس کا مظاہرہ ہمارے ہاں کے متجددین کر رہے ہیں۔ ہم ان تمام بحثوں کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی تردید ہمارے نزدیک بالکل غیر ضروری ہے۔

مصنف کو یہ بھی شکوہ ہے کہ "لوگ بات بات میں قرآن مجید کی طرف دوڑنا شروع کر دیتے ہیں اور جن باتوں کا فیصلہ ہمیں علم و عقل اور تجربہ ہی کی رُو سے کرنا چاہیئے ان کیلئے بھی قرآنی سندیں ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ مذہب کا دائرہ عمل سائنسی تحقیقات نہیں اور نہ ہی وہ ہماری روزمرہ کی ہر بات میں دخیل بننا چاہتا ہے"۔ شائد مصنف کو یہ معلوم نہیں کہ مذہب کا تعلق محض تصورات و خیالات ہی سے نہیں بلکہ ہمارے روزمرہ سے بھی ہے۔ اور قرآن میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ بھی ہماری روزمرہ ہی کی زندگی میں ہماری رہنمائی کے لئے ہیں۔ اس لئے جب تک لوگوں میں دین کی کوئی رمق باقی ہے وہ تو ہر معاملہ میں قرآنی سند تلاش کرنا اپنا فرض عین سمجھیں گے اور کسی بھی لال بجھکڑ کو اس بات کی اجازت نہ دیں گے کہ وہ ان کی دینی تعلیمات کی لاطائل تاویلات ان کے سامنے پیش کرے۔

۱۷۳ صفحات کی یہ کتاب مجلد ہے اور اس کی قیمت دو روپے پچاس پیسے ہے۔

(خ۔م)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔

Regd. No L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore.

September 1963

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قران (قران فہمی کی رہنما)	3—25
تدبر قران (تفسیر آیہ بسم‌اللہ و سورہ فاتحہ)	0—75
اسلامی قانون کی تدوین	3—00 و 2—00
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ	2—25
تزکیہ نفس	6—00 و 3—75

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد ص	22—50
(آنحضرت ص) سیرت ابن ہشام	10—00
ابوبکر رض صدیق اکبر	10—00
عمر رض فاروق اعظم	20—00
امام اعظم رح	4—00
حیات امام احمد بن حنبل رح	10—00
آثار امام شافعی رح	12—00
حیات امام مالک رح	10—00
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح	21—00
زاد سفر (حصہ اول)	3—75
قادیانیت	4—00
ISLAM & THE WORLD	4—00

مکتبہ میثاق (رحمان پورہ) - اچھرہ - لاہور—12